کلّیاتِ اصغرؔ

مولانا اصغر حسین اصغر گونڈوی کے شعری مجموعوں
نشاطِ رُوح اور سرودِ زندگی کا مکمّل اور صحیح متن
معہ کلامِ غیر مطبوعہ

اصغرؔ گونڈوی

کِتابی دُنیا دھلی

خالص اللہ کی رضا اور جذبۂ خدمتِ خلق کے تحت کتب کی پی ڈی ایف فائلز بنائی جاتی ہیں۔
کسی بھی قسم کا کاروباری مفاد پیشِ نظر نہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ شکریہ

PDF By : Ghulam Mustafa Daaim

اصغر گونڈوی

کلیاتِ اصغر

یعنی

مولوی اصغر حسین اصغر گونڈوی کے شعری مجموعوں
نشاطِ روح اور سرودِ زندگی کا مکمل اور صحیح متن
معہ کلامِ غیر مطبوعہ

© جملہ حقوق محفوظ!

KULLIYAT-EASGHAR

by

ASGHAR GONDVI

Year of Edition : 2004

ISBN-81-87666-86-2

Price Rs. 80/-

نام کتاب ..... کلیاتِ اصغر

شاعر ..... اصغر گونڈوی

سنہ اشاعت ۲۰۰۴ء

قیمت ..... ۸۰ روپے

مطبع ..... کاک آفسیٹ پرنٹرس۔ دہلی

Published by:

KITABI DUNIYA

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
Phone: 23288452, Reliance Mobile: 35972589
E-mail: kitabiduniya@rediffmail.com

مندرجات

مقدمہ ۷

نشاطِ رُوح

نعت حضور سرورِ کائناتؐ ۲۱
بیخبری ۲۳
سترِ فنا ۲۵
غزلیات ۲۷—۵۸
متفرقات ۵۹

سرودِ زندگی

اپنی انتہا ہو جا ۶۳
غیب ہو گیا ہے شہود ۶۴
کیا ہوں میں ۶۴
خطاب بہ مسلم ۶۶
چمکِ برقِ طور میں ۶۷
جیب و گریباں کو ۶۸
ثبوت زندگی کا ۶۹
تقاضائے عشق ہے ۷۰
سنبھلنا چاہیئے ۷۰
ہر اِک انقلاب میں ۷۱
مہ و انجم جواب میں ۷۲
رگِ جاں بنا دیا ۷۳
میرے آشیانے سے ۷۴
شام نہیں، سحر نہیں ۷۵
سب طرزِ نظر ہے ۷۵
صبحِ خندانِ بہار ۷۶
دامنِ پاکباز میں ۷۷
مری نگاہ میں ۷۸

چشمِ انجم باز ہے	۷۹
حسنِ کار سُوا ہونا	۸۰
کو ان پروانے میں ہے	۸۱
تجھ کو سراپا دیکھیں	۸۲
محمل دیکھنے والے	۸۳
نہ ہم منزل سمجھتے ہیں	۸۴
خُدا کے سامنے	۸۵
شعلہ افشانی نہیں جاتی	۸۶
کچھ حُسنِ نظر سے	۸۷
میری قسمت کی	۸۸
باز رہنے دے	۸۹
ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے	۹۰
کچھ بھی خبر نہیں	۹۱
سرشارِ محبت میں نہیں	۹۲
ہنگامہ آرا دل میں ہے	۹۳
دُنیا آپ پیدا کیجئے	۹۴
جرأتِ رندانہ برسوں سے	۹۴
اُٹھائے گی قیامت مجھ کو	۹۶
رنگینیٔ مینا سمجھتے ہیں	۹۷
معصیت ہے باخبر ہونا	۹۹
سرگرمِ سفر سمجھا تھا مَیں	۱۰۰
اگر ہم جام و مینا دیکھتے	۱۰۲
مدّعا اتنا حسیں ہوتا	۱۰۲
چمن بیدار ہو جائے	۱۰۴
ابد تک نشاں رہے	۱۰۵
عجیب عالم ہے	۱۰۶
کُفر و ایماں دیکھئے	۱۰۸
اُس نے پُکارا مجھ کو	۱۱۰
جب کوئی صیّاد نہ ہو	۱۱۱
مَیں نے چمن لٹا دیا	۱۱۲
رشحات	۱۱۳
فارسی اشعار	۱۱۵
اشعار (غیر مطبوعہ)	۱۲۰

مقدمہ

مولوی اصغر حسین اصغرؔ ۱۸۸۴ء میں گونڈہ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے والد تفضل حسین قانونگو تھے۔ ابتدائی تعلیم گونڈہ میں پائی۔ مگر بعض خانگی وجوہ سے آٹھویں جماعت سے آگے نہ بڑھ سکے۔ بعد میں ذاتی انہماک اور مطالعہ سے اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں خاصی استعداد پیدا کرلی۔ ایک روایت کے مطابق ان کی جوانی فسق و فجور کی نذر ہو گئی، مگر جلد ہی سنبھل گئے۔ قاضی سید عبدالغنی کاظمی منگلوریؒ سے بیعت ہو کر اُن کی صحبت سے شرافتِ نفسی کو اپنا مطمحِ نظر بنایا اور درویشی اور قناعت پسندی اختیار کی۔ بود و باش، خوراک اور لباس کے معاملہ میں نفاست، سلیقہ اور وضعداری ان کا شیوہ تھا۔ روزمرہ کے معاملات میں بھی اخلاق کا دامن نہ چھوڑتے تھے۔ مشاعروں میں شرکت سے عموماً اجتناب کرتے تھے۔ وسیع المشرب اور کثیر الاحباب تھے۔ مذہب، فلسفہ اور شعر و ادب

پر وقیع گفتگو کرتے۔ مگر بذلہ سنجی اور ظرافت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ہر حال میں راضی برضا رہتے۔ شروع میں عینک سازی کا دھندہ کیا۔ پھر کچھ عرصہ کے لئے ریلوے انجینئرنگ کے دفتر میں کام کرتے رہے۔ پھر انڈین پریس الہ آباد میں ملازمت اختیار کی۔ ۲۹ نومبر ۱۹۳۶ء کو بہ عارضہ فالج انتقال کیا اور حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادی قدس سرہ، کے احاطۂ مزار میں آسودۂ خوابِ ابدی ہوئے۔ کلام کے دو مجموعے نشاطِ روح اور سرودِ زندگی متعدد بار شائع ہو چکے ہیں "اردو شاعری کی ذہنی تاریخ" کے عنوان سے ایک تنقیدی مقالہ بھی سپردِ قلم فرمایا تھا، جو غالباً حلیۂ طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔

اصغر نے متذکرہ دو شعری مجموعوں میں جس کائنات کی تخلیق کی ہے وہ اپنی مختصر جسامت کے باوجود ہر اعتبار سے کامل و شامل ہے۔ اس کائنات کی بنیادی قدر عشق و محبت ہے۔ اصغر کا عشق کوئی ارضی جذبہ نہیں، بلکہ اپنے انتہائی تجزیہ میں ان کی نوعیت خالص تجریدی ہے۔ یہ زندگی کا حرکی عنصر ہے۔ زندگی کی تیز گامی اور سخت کوشی اس عشق کا ایک کرشمہ ہے۔ زندگی کی ساری رعنائی و زیبائی اسی کے طفیل ہے۔ عشق جہاں ابنِ آدم کے لئے اس جہانِ مہ و انجم سے کہیں وسیع تر دشت کا طالب ہے، وہاں اس نے زمان و مکان اور این جہاں و آں جہاں کی وسعتوں میں اپنی وحشتوں کو بیکار بکھیر دینے کے بجائے اُسے زندگی کا ایک نقطۂ ارتکاز بھی دیا ہے۔ جبھی تو نظامِ عالم بیتابیوں کے مظاہر کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ آرا ہے۔ جبھی تو سمک سے سماک اور ذرہ سے ثریا تک کائنات کا ذرہ ذرہ دیوانگی شوق کے عالم میں ایک ازلی رقص میں محو ہے۔ ان ذرّوں کا رقص اسی

صبائے عشق کی مستی کا رہینِ منت ہے۔ ذروں کی یہ تپش، یہ تڑپ، اجرامِ فلک کی یہ بے قراری اسی جذبۂ عشق کے اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی کے سہارے یہ قافلۂ بے تاب نہ جانے کون سی منزل کی جانب سرگرمِ سفر ہے؟ زندگی اسی رقصِ مسلسل، اسی لذتِ جوشِ طلب، اسی تگاپوئے مدام سے تو عبارت ہے۔ ورنہ شوریدگانِ شوق کے سامنے بھی بھلا کوئی معین مقصود، کوئی مقرر منزل ہوا کرتی ہے؟ یہی عملِ پیہم تو زندگی ہے زندگی گویا ایک پرواز ہے اور کوتاہیٔ عمل گرفتاری۔

اگر زندگی عمل، حرکت اور انقلاب ہی کا دوسرا نام ہے تو اس زندگی کا جواز سخت کوشی اور عملِ پیہم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور پھر موت منزل کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ کیونکہ موت مساوی ہے سلسلۂ عمل کے انقطاع کے۔ اصغرؔ کے فلسفۂ حیات کے مطابق جہد و کشاکش، جستجوئے مسلسل، تلاشِ سراب، تجدیدِ تمنا، سوزِ تلاطم زندگی کے مختلف مظاہر ہیں، جب کہ دوسری جانب سکون و سلامتی، عافیتِ کنجِ چمن، منزلِ مقصود سیرِ ساحل موت کے مرادفات ہیں۔ کیونکہ اپنے حرکی عنصر سے علیحدہ ہو کر زندگی اپنی ضد میں بدل جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں سلامتی خطرۂ جاں ہے۔ اور آسانیاں زندگی کو دشوار بنا دیتی ہیں، عشق کی ناکامیاں ہی اس کا عین حاصل ہیں۔ حسن اور عشق کے رشتہ میں خود فطرت نے اس حرکی پہلو کا التزام کر رکھا ہے۔ طلب عشق کی خاصیت ہے اور لامحدودیت حسن کی حقیقت۔ بہ ایں حالت حسن عشق کو تشنہ لبی کے سوا کیا دے سکتا ہے؟ اور پھر اسی تشنہ لبی پر تو عشق کی بقا کا دار و مدار ہے۔

اپنی نشو و نما کے لئے یہ سخت کوشی اور عملِ پیہم فکر و تعقل کے نہیں، جوش و جذبہ کے رہینِ منت ہیں۔ اس لئے اصغرؔ کہتے ہیں کہ شعورِ غم اور فکر کا ... کار سے مستغنی ہو کر انسان ذرہ

میں وسعتِ بیابان اور قطرہ میں بحرِ بے پایاں کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ لہذا ہوش و خرد کے پھیر میں عمرِ عزیز کو ضائع نہ کرنا چاہیئے اور موت تک عاقل و فرزانہ بننے کا خیال یک قلم ترک کر دینا چاہیئے۔ جستجو محسوس و مرئیاں پر بھی حجاب ڈال دیتی ہے اور ہوش و خرد سے فضائے صاف بھی زنداں میں بدل جاتی ہے۔ عقل سامنے کی بات کو نظر کہہ کر دُھل کی لیتی ہے۔ دراصل رازِ حیات کی کلید بے خودی ہے۔ یہی بے خودی اصل علم و حکمت ہے۔ ایک لغزشِ مستانہ باعثِ صد رشکِ طریقت ہے۔ یہی بے خودی تو ہے جو انسان کو ہر حال میں ایک ہی صورت پیشِ نظر رکھنے کے قابل بناتی ہے۔ اِسی بے خودی کی بدولت وہ ابدی طور پر روزِ وصل اور شبِ ہجراں دونوں سے ماورا ہو جاتا ہے شاید یہ ماورائیت ہی نجاتِ ابدی کا ایک وسیلہ ہے۔ اصغرؔ کے نزدیک عاشقی ہر اک شے سے تہی ہو ملنے کا دوسرا نام ہے۔ وصل کی لذت اور ہجر کی کلفت سے ماورا ہو کر ہی دوائے درد اور دردِ بے دوا سے استغناء حاصل ہوتا ہے۔ رنگِ نشاط کی حیثیت بازیچہ لذت سے زیادہ نہیں۔ مگر دردِ ہجر کی فتنہ سامانی سے انکار کون کرے؟ ان دونوں سے کماحقہٗ گزر جانے کے بعد ہی بے حسی کے انداز آتے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جسے فلسفۂ ہنود میں کیفیتِ ماوراء الاضداد (و وندواتیت ستھتی) کہا گیا ہے۔ یہاں پہنچ کر کنجِ قفس اصلِ گلستان ہوتا ہے اور دردِ ہجر اور لذتِ وصال کے درمیان ذہنی کشمکش میں مبتلا ہونے کے بجائے ان دونوں سے بلند مقام موضوعِ نظر بن جاتا ہے۔

جس طرح ذہنِ انسانی کی ماوراء الاضداد کیفیت اُسے مثبت اور منفی کی کشمکش سے نجات دلاتی ہے۔ اسی طرح حقیقتِ مطلق کا صحیح روپ اسماء و صور سے بے نیاز، خالصتاً تجربی اور ماوراء الاظہار ہے۔ خاموشی عین احترامِ حسن ہے اور اظہار، اصغرؔ کے نزدیک

بے ہودہ کوشی اور ہرزہ سرائی کے مترادف ہے۔ حسن بے پایاں، لا محدود اور ماورائے سخن ہے۔ اظہار سے اس کی تحدید ہوتی ہے، توضیح نہیں۔ ذرا غور فرمائیے تو خاموشی کے صدہا معانی ہیں اور اظہار کی حیثیت ایک مطلب مقید سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں۔ پھر بھلا اس حریم قدس میں لفظ و معنی کا گذر کیسے ہو سکتا ہے!

ذہن انسانی نے اس مجرد حقیقت مطلق کی تجسیم کے لئے دیر و حرم کی تخلیق کر ڈالی، مگر فی الحقیقت بندگی بے نیاز کفر و ایمان ہے۔ جلوۂ جانانہ کے دیدار کے بعد کعبہ و صنم خانہ کی احتیاج باقی نہیں رہتی۔ دیر و حرم تو فقط راستہ کے پڑاؤ ہیں۔ منزل جاناں ان سے کہیں آگے ہے۔ دیر و حرم اظہار کی مختلف صورتیں ہیں۔ لہذا بے پایاں اور لا محدود حقیقت ان کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ اظہار سے ان کی صرف تحدید ہوتی ہے۔ دیر و حرم مثبت اور منفی پہلوؤں کے مترادف ہیں اور حقیقت ان سے ماورا ہے جسے اصغر "میکدہ" کا نام دیتے ہیں، کیونکہ حقیقت تک تعقل سے نہیں بے خودی کے زینہ سے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔

عقل سرکش ہے اور بے خودی عجز و نیاز کے راستہ پر چلتی ہے۔ اصغر کے نزدیک خستگی و عاجزی کا مقام بہت اعلیٰ ہے۔ یہی خستگی ہے جو حقیقت مطلق کو ماورائیت کی بلندیوں سے اُتار کر رگ جاں کے قریب لے آتی ہے جب کہ تعقل کی کنیز خاص جستجو اسے کئی منزلیں دکھلا لے جانے کے درپے رہتی ہے۔ دو دِ تہ جام میں انتہائے کیف صرف افتادگی و پستی کی بدولت ہے۔ نیاز عشق جہاں بھی سر رکھ دے، ہزاروں کعبے معرض وجود میں آجاتے ہیں۔ اسے راز افتادگی اور لذت خستگی ہی کا اعجاز سمجھئے کہ سور برق آشیانہ کے تنکوں کی شکستگی سے لرزتی ہے۔ اس لئے ہزارہا معبود بنانے کے بعد نئے اصنام کی پیکر تراشی کے بجائے اصغر نیاز سجدہ کو شائستہ و مکمل کرنے پر زور دیتے ہیں۔

بے زبان اور زبانِ بے رنگ کو جلووں کے شرح و بیان کی کیسے ہمت ہو سکتی ہے؟ اصغرؔ کو اپنی بے مائیگی اور خاکساری پر بجا طور پر فخر حاصل ہے۔ اسی بے مائیگی کے طفیل وہ ذرّہ خود شناس کے مرتبہ پر پہنچے ہیں۔ لیکن یہ وہ ذرّہ ہے جس نے اس جہانِ راز میں حشر سا بپا کر رکھا ہے۔

عجز و نیاز کی منزل سے گزر جانے کے بعد ہی شاعر کو اپنے صحیح مقام کا عرفان ہوتا ہے جبھی وہ اس حقیقت سے صحیح معنوں میں دوچار ہوتا ہے کہ عرصہ وجود میں اسی کی گرم روی کا غبار ہے، جسے دنیا کا نام دیا گیا ہے۔ اس عندلیبِ زار کی حیثیت اگرچہ ایک مشتِ پر سے زیادہ نہیں۔ مگر بایں ہمہ بے چارگی وہی چمن کے پتہ پتہ پر چھائی ہوئی ہے۔ موجودات کے مرقع میں حُسن کی اپنی جلوہ آرائی کے علاوہ حسنِ نظر کے آب و رنگ کی تابانی بھی ہے رُخِ روشن کے نور میں کیفِ نظر کا بھی ایک حصّہ ہے۔ محبوبِ مطلق کی اداؤں کی داستانِ رنگین میں اس کا کچھ اپنا خونِ تمنا بھی شامل ہے۔ عشوۂ جاں گداز میں اس کے اضطرابِ شوق کا بھی دخل ہے۔ ایوانِ آرزو میں شاہدِ مطلق کے ساتھ ساتھ اُس کا اپنا حسنِ خیال بھی ہے۔ اور اس سے آگے سجدۂ بے نیاز میں وہ خدا تک کو بھی بھول جاتا ہے۔ انتہائے بے خودی کا یہی تو تقاضا ہے۔ اب اس کی ایک ایک تمنا سے سو سو حُسنِ تخلیق ہوتے ہیں! شعلۂ طور تک اُسے اپنا ہی ذوقِ نظر دکھائی دیتا ہے۔ خواب میں سو بار شاہدِ حقیقی کا دامن پکڑتا ہے۔ مگر آنکھ کھلنے پر اپنا گریباں اپنے ہی ہاتھوں میں پاتا ہے۔ اور آخر کار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے "یا اللہ! تو نے یہ غضب کی مشتِ خاک زیرِ آسمان رکھ چھوڑی ہے کہ اس کے باعث ایک عالم میں تلاطم سا بپا ہے۔ اس مشت پر میں جو آگ پوشیدہ ہے۔ وہ کہیں محفلِ ہستی کو پھونک کر راکھ نہ کر ڈالے!" خدائے بزرگ

جوشِ بندگی کا ایک کرشمہ نظر آتا ہے۔ اپنی رنگینیٔ نظر سے ایک عالمِ دگر پیدا کر دینے کے جوش میں اُسے خالقِ کون و مکان کا عالم اُسے بہ شکریہ لوٹا دینے کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا۔ لیکن یہ رنگینیٔ نظر بھی تو آخر اُس خالقِ کُل کے جلوۂ حُسن کا فیضان ہے!

اور آخر کار جب یہ منکشف ہوا کہ نظر اور حسنِ نظر میں بُعد المشرقین نہیں، تو سیرِ نظر کی وسعت ذرّہ ذرّہ میں جہانِ نامشہود کے دیدار کے درپے ہو جاتی ہے اور دل سے یہ سوال اُٹھتا ہے کہ جب، اُس بن یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے تو پھر یہ سارا ہنگامہ ہماری کم نظری کا منّت پذیر ہونے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اب دلِ شوخ و حیلہ جو کو اس رنگ و بُو کی کمین گاہ میں طائرِ قدس کو اپنے دام میں لینے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ ایک گُل کے آنکھوں میں سما جانے کے بعد آتشِ گُل سے سارا چمن دہکتا نظر آتا ہے اور سوادِ دیدہ جہاں جہاں چاہتا ہے، اُسی روئے زیبا کا جلوہ دیکھنے لگ جاتا ہے۔ تو یہ نو جلوہ ہائے رنگین کی فراوانی کے آگے نگاہ کو اپنی تنگ دامانی کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ روائے لالہ و گُل ہو یا بردۂ مہ و انجم، نغمۂ رنگیں ہو یا شاہدِ زیبا، وہی حسنِ دوست ہے جو صدہا حجاب صورت و معنی لئے ہوئے بے پردہ و آشکار جلوہ آرا نظر آتا ہے۔ کبھی محجوبیاں شانِ مستوری میں اُس کے جلوہ کی ادا کو نمایاں کرتی ہیں۔ اور کبھی محرومیاں کسی دُوری پر اُسے تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔ مگر وہ بے لفظ و بے صدا نغمہ تمام موجوداتِ عالم پر محیط ہے۔ بیاضِ حقیقت کی سادگی کسی نقش آرائی کی مرہونِ احسان نہیں۔ یہ تمام نقوش جسے ذہن انسانی نے تخلیق کیا ہے، حقیقت نہیں، ماسوائے اللہ ہیں۔

اور یہی حقیقتِ مطلق کا اصل جلوہ ہے۔ اسماء (نام) اور صُور (رُوپ) سے مستغنی اُس ذاتِ بے ہمتا کا نظارہ جز دلِ حیرت آشنا اور کون کر سکتا ہے؟ اب

عقل (بُدھی) ساکن (شانت) ہو گئی۔ یہ جلوۂ بے رنگ، یہی کیفِ بے رنگیٔ حیرت صحیح معنوں میں نظر کی معراج ہے۔ اس طرح محرومِ تماشا ہونا ہی دراصل حاصلِ نظارہ ہے۔ خاموشی اور حیرت ہی دراصل شاہدِ حقیقی کا صحیح مشاہدہ ہے۔ کیونکہ اظہار تحدید ہے اور تفکر صرف طرزِ نظر کو جنم دیتا ہے۔ اور پھر جلووں کے ازدحام کے باعث بھی فکر و تعقل عاجز ہیں۔ فکر کی کارفرمائی میں وہ نمایاں ہونے کے بجائے زیادہ مستور ہو جاتا ہے

اصغرؔ مرحوم اپنی پرائیویٹ زندگی میں نفاست پسندی اور وضعداری کا نمونہ تھے۔ اور ان ذاتی اوصاف کا پرتو اُن کے کلام میں واضح طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ اگر شعر گوئی کا عمل نگوں کے جڑنے سے کم نہیں تو لاریب اصغرؔ ایک مشّاق مرصّع ساز تھے۔ مگر اُن کی صنّاعی جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری نہیں۔ کیونکہ وہ نظر کو خیرہ ہی نہیں کرتی، قلب کو جِلا بھی دیتی ہے۔ اُن کے کلام میں جہاں ایک طرف پُرسطوت شیرینی کے ساتھ صفائی کا حیرت انگیز امتزاج ہے، وہاں دوسری جانب اُن کا کوئی شعر فکری بلندیوں سے عامیانہ ذہنی سطح پر اُترتا نظر نہیں آتا۔ اُن کی ہر غزل میں صُورت و معنیٰ کے کئی عالم آباد ہیں۔ اُن کا کلام ہنگامی اور زُود فنا اثر انگیزی کا حامل نہیں۔ بلکہ اس میں قدم قدم پر قاری کو یا تو از خود رفتہ کر دینے یا پھر اُسے غور و فکر پر مجبور کر دینے کی صلاحیت نظر آتی ہے۔ اصغرؔ کی شعر گوئی کے آغاز میں اُردو غزل اپنے مخصوص فرسودہ مضامین اور لفظی شعبدہ بازی کے حصار میں محدود ہو کر انحطاط کا شکار ہو رہی تھی۔ بیسویں صدی کی اُردو غزل گوئی کے عروقِ مردہ میں جن شعراء نے تازہ خون دوڑانے کی سعی کی، اصغرؔ اُن میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ وہ غزل کو شاعر کے حقیقی یا فرضی

غم و آلام کے اظہار کے لئے آلۂ کار نہ بنانا چاہتے تھے۔ بلکہ اس کے ذریعہ ایک شعارِ معنوی گردش میں لانا، نشاطِ روح کا ایک چمن کھلانا اُن کے پیشِ نظر تھا۔

اپنے شعری مجموعوں میں دو مقامات پر اصغرؔ نے بالواسطہ طور پر حافظؔ شیرازی کو ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ ان دونو شعراء میں قدرِ مشترک اپنے احساسات کے تئیں ان کا والہانہ خلوص ہے۔ جو ان کے کلام کا رشتہ براہ راست صحائف الہامی سے جا ملاتا ہے اور الہامی تحریروں سے جو اُلوہی تاثر منتج ہوتا ہے، وہ ان دونو کی غزلیات میں بدرجۂ کمال موجود ہے۔ دونو کے ہاں مضامین کی گوناگونی اور خیالات کی بوقلمونی بہت کم ہے۔ مگر حدیثِ شوق کے پسِ پردہ جو شیفتگی، جوش اور حدّت کارفرما ہے، اس کے طفیل مکرّر طبیعت کے لئے ملال انگیز نہیں ہونے پاتا۔

کچھ لوگوں نے اس بات کا محاکمہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا اصغرؔ حقیقتاً صوفی منش اور صافی ضمیر تھے؟ یا بقول شیخ علی حزیں تصوّف کا موضوع صرف "برائے شعر گفتن" اختیار فرمایا تھا۔ بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے۔ تو کسی نقاد کا اس بحث میں ایک یا دوسرے نتیجہ پر پہنچ جانا محض تخصیل حاصل ہوگا، کسی شاعر، ادیب یا فن کار کی شخصیت کے کئی پہلو، کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ ان میں بعض پہلو بظاہر متناقض ہونے کے باوجود جُداگانہ طور پر اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ذہنی زندگی اور فنی اظہار میں گہرا تعلق ہونے کے باوجود بعض صورتوں میں ان میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں جہاں ایک سطح پر فن شخصیت کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے، دوسری پر وہ اس کے اخفا کا ایک وسیلہ بن جاتا ہے۔ غالب

کی بادہ خواری مسلّم، مگر اس کے باوجود وہ مسائلِ تصوّف کو بھی اپنے بیان سے پُر اثر بنا سکتے تھے۔ اور حق تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنے کلام میں ولایت تو کیا، نبوّت کی شان پیدا کی۔ اُن کے مقابلہ میں دنیائے ادب میں صوفیائے کرام شعراء کا ایک ایسا گروہ بھی نظر آتا ہے۔ جن کے سلسلۂ رشد و ہدایت کا ایک عالم حلقہ بگوش تھا۔ مگر جن کی شاعری کا تاثّر معلوم۔ جن لوگوں نے اصغر مرحوم سے سالوں تلک ملاقات کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ان میں بعض نے اُن سے بیعت ہونے کا بھی ادّعا کیا ہے۔ لیکن اُن کی روایت سے قطع نظر کر لیا جائے، تو بھی اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ بے پناہ خلوص اور شدّتِ اظہار کے باعث اصغر کے کلام میں وہ حُسنِ تاثیر ہے جو کسی بھی عارف باللہ کے ملفوظات میں ہو سکتا ہے۔

بعض نقّادانِ ادب نے اصغر کو غالب سے متاثر ثابت کرنے کی سعی کی ہے۔ ہماری دانست میں وہ غالب سے متاثر ضرور تھے۔ مگر بہت محدود معنوں میں۔ جہاں تک الفاظ کے انتخاب اور تراکیب کے ترک و اختیار کا تعلّق ہے، اصغر کے کلام میں غالب کا اثر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ دلِ شعلہ آرزو، واماندگی، ذوقِ تماشا، ہجومِ دردِ غریبی، نو بہارِ ناز، داغِ صحبتِ رُوحانیاں، کاوشِ بے مدّعا، مستانہ کر رہا ہوں... الخ، ہر بنِ مو سے ٹپکتا ہے.... الخ، عبث ہے دعویٰ عشق و محبت... الخ اور اس قبیل کی کئی تراکیب اور جُملے ہیں۔ جو اصغر نے براہِ راست غالب سے لئے ہیں۔ لیکن زبان سے قطع نظر اگر موضوعات کو لیں تو عظمتِ آدم، منزل سے استغناء، سخت کوشی، فلسفۂ عملِ پیہم، ناز و نیاز کا امتزاج، مسئلۂ وحدت الوجود

وغیر ذلک کو جس شدت و حدت کے ساتھ انہوں نے اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے اس سے وہ صاف طور پر علامہ اقبالؒ کے پہلو میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ اصغرؔ نے غالبؔ اور اقبالؔ دونو سے کسبِ ضیا کیا ہے۔ مگر یہ اکتساب کورانہ تقلید نہیں۔ جدید اردو غزل میں اصغرؔ ایک منفرد مقام کے مالک ہیں۔ وہ اردو شعراء کے اُس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں جس سے سراجؔ اورنگ آبادی، خواجہ میر دردؒ، آسیؔ غازیپوری اور فانیؔ بدایونی جیسے شعرائے عظام اور شاہ نیاز بریلویؒ اور حضرت جی شاہ غمگینؒ جیسے صوفیائے کرام منسلک تھے۔ اُن کے کلام میں فکری، فنی اور ادبی محاسن کا جو خوبصورت امتزاج ملتا ہے، اردو ادب کی تاریخ میں اس کی مثالیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔

کرشن کانت

"چمن زار"،
محلہ شو کوٹ،
بٹالہ (پنجاب)
۱۳ نومبر ۱۹۷۶ء

نشاطِ روح

اصغؔر نشاطِ رُوح کا اِک کِھل گیا چمن
جُنبش ہُوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نعت حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

کچھ اور عشق کا حاصل نہ عشق کا مقصود
جزا نیکہ لطفِ خلشہائے نالۂ بے سود

مگر یہ لطف بھی ہے کچھ حجاب کے دم سے
جو اُٹھ گیا کہیں پردہ تو پھر زیاں ہے نہ سود

ہلائے عشق نہ یوں کائناتِ عالم کو
یہ ذرّے دے نہ اُٹھیں سب شرارۂ مقصود

کہو یہ عشق سے چھیڑے تو سازِ ہستی کو
ہر ایک پردہ میں ہے نغمۂ "ھُوالموجُود"

یہ کون سامنے ہے؟ صاف کہہ نہیں سکتے
بڑے غضب کی ہے نیرنگی طلسمِ نمُود

اگر خموش رہوں میں، تو تُو ہی سب کچھ ہے
جو کچھ کہا، تو ترا حُسن ہو گیا محدُود

جو عرض ہے اُسے اشعار کیوں مرے کہیئے
اُچھل رہے ہیں جگر پارہ ہائے خُوں آلود

نہ میرے ذوق طلب کو ہے مُدعا سے غرض
نہ گامِ شوق کو پروائے منزلِ مقصُود

مرادِ جُود ہی خود انقیاد و طاعت ہے
کہ ریشہ ریشہ میں ساری ہے اِک جبینِ سجُود

مقامِ جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے
مَیں بیخبر ہوں باندازۂ فریبِ شہود

جو اُڑ کے شوق میں یوں محوِ آفتاب ہُوا
عجب بلا تھا یہ شبنم کا قطرۂ بے بُود

چلوں، میں جانِ حزیں کو نثار کر ڈالوں
نہ دیں جو اہلِ شریعت جبیں کو اذنِ سجُود

وہ رازِ خلقتِ ہستی، وہ معنیٔ کونین
وہ جانِ حُسنِ ازل، وہ بہارِ صُبحِ وجُود

وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کُنجِ حرا
وہ دِل کا نُور، وہ اربابِ درد کا مقصُود

وہ سرورِ دو جہاں، وہ محمدِ عربی
بہ رُوحِ اعظم و پاکش درُودِ نامحدُود

صبائے حُسن کا ادنیٰ سایہ کرشمہ ہے
چمک گئی ہے شبستانِ غیب و بزمِ شہُود

نگاہِ ناز میں پنہاں ہیں نکتہ ہائے فنا
چھُپا ہے خنجرِ ابرُو میں رمزِ "لا موجُود"

وہ مستِ شاہدِ رعنا، نگاہِ سحر طراز
وہ جامِ نیم شبی نرگسِ خمار آلُود

کچھ اس ادا سے مرا اُس نے مدعا پوچھا
ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصُود

ذرا خبر نہ رہی ہوش و عقلِ ایماں کی
یہ شعر پڑھ کے وہیں ڈال دی جبینِ سجُود

"چو بعد خاک شدن یا زیاں بود یا سُود
بہ نقد خاک شوم بنگرم چہ خواہد بُود"

(رومیؒ)

”بیخبری“

ہزار جامہ دری صد ہزار بخیہ گری
تمام شورش و تمکیں نثارِ بے خبری

سکونِ شورشِ پنہاں ہے شغلِ جامہ دری
قرارِ سینۂ سوزاں ہے نالۂ سحری

مزاجِ عشق بہت معتدل ہے ان روزوں
جگر میں آگ دہکتی ہے آنکھ میں ہے تری

یہ ڈر ہے ہوں ہوا اب لہو نہ دے نکلے
مجھے کچھ ایسے زور پہ ہے آج کاوشِ جگری

جو مجھ پہ گزری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

اٹھا ہے درد، رگِ جاں ہے تشنۂ نشتر
مجھے ہے آج تلاشِ کمالِ چارہ گری

غرض نشاط والم سے فقط تماشا ہے
کہ یہ مناظرہ اور میں ہوں رہ گزری

نہ مدعا کوئی میرا نہ کچھ ہراس مجھے
کہ عاشقی ہے فقط بے دلی و بے جگری

نگاہِ ناز کی کیفیتیں ہیں دل میں وہی
کہ روح تن میں ہو شیشہ میں جس طرح ہو پری

تری نگاہ کے صدقے یہ حال کیا ہے مرا
کمالِ ہوش کہوں یا کمالِ بے خبری

غضب ہوا کہ گریباں ہے چاک ہونے کو
تمہارے حسن کی ہوتی ہے آج پردہ دری

کہیں ہے عشق کہیں ہے کشش کہیں حرکت
بھرا ہے خامۂ فطرت میں رنگِ فتنہ گری

محال تھا کوئی ہوتا یہاں سوا تیرے
بہ کُل جہان ہے منت پذیرِ کم نظری

وہ ہر عیاں میں نہاں ہے وہ ہر نہاں میں عیاں
عجیب طرزِ حجاب و عجیب جلوہ گری

کچھ اس طرح ہوئیں عجز نوازیاں اس کی
کہ میری آہ کو ہے اب تلاشِ بے اثری

نزول پیکرِ خاکی پہ رُوح اعظم کا
نہ ہے کمالِ سرافگندگی و بے ہنری

کرم کچھ آج ہے ساقی کا وہ طرب انگیز
کہ جرعہ جرعہ ہے موجِ ترنمِ سحری

اُس آستاں سے اُٹھائی نہ پھر جبیں میں نے
حرم میں سجدۂ پیہم تھی ایک دردِ سری

چھپی ہے نیم نگاہی میں رُوحِ بے تابی
ملی ہے حُسنِ تبسم کو ریزشِ شرری

نہ جانیے مری بگڑی ہوئی اداؤں پہ
کہ عاشقی میں مری حُسن کی ہے جلوہ گری

جو شوخیوں سے لیا ہے جمال بے تابی
تو جوشِ حُسن ... ہے پائی ادائے جامہ دری

لیے ہیں زُلف سے آشفتگی کے کل انداز
نگاہِ مست سے پہنچا ہے حُسنِ بیخبری

خموش اصغرِ بے ہودہ کوش و ہرزہ سرا
کہ حُسن و عشق کی اچھی نہیں ہے پردہ دری

بگوشِ ہوش شنو پند حافظ شیراز
چہ نکتہ ایست بہ طرز ترنم شکری

"چو ہر خبر کہ شنیدم رہے بہ حیرت داشت"
"ازیں سپس من و ساقی و وضع بے خبری"
(حافظؒ)

سِرِّ فنا

رہا نہ دل میں وہ احساسِ مدّعا باقی
نہ رُوح میں ہے وہ بے تابیٔ دُعا باقی

وہ لب پہ شوق و طلب کی حلاوتیں نہ رہیں
نہ وہ کلام میں رنگینیٔ ادا باقی

فسانۂ شبِ ہجراں کی لذّتیں نہ رہیں
نہ اَب ذرا ہوسِ ظُلمِ ناروا باقی

شرارتیں نگہِ شوق کی ہوئیں رُخصت
رہا نہ ولولۂ آہِ نارسا باقی

دلِ حزیں میں تڑپنے کی وہ سکت نہ رہی
نہ تارِ اشک کا اَب کوئی سِلسلہ باقی

کھٹک کہیں نہ رہی دردِ جاں نواز کی اَب
نہ وہ لطیف خلش دل میں اب ذرا باقی

غضب تو یہ ہے کہ ہے سازِ عاشقی خاموش
نہ گفتگو کوئی باقی نہ ماجرا باقی

نہ اب وہ عرضِ مطالب میں شوخیٔ عُنواں
نہ اب وہ شوق کی نیرنگیٔ ادا باقی

رہی نہ وصل کی لذّت نہ ہجر کی کُلفت
دوائے درد نہ اَب دردِ بے دوا باقی

یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا
کہ اَب نگاہ میں عبرت نہیں ذرا باقی

نہ اَب وہ ذوقِ عبادت کی سعیٔ لاحاصل
نہ اَب وہ لذّتِ عصیاں کا ولولہ باقی

نہ وہ بیاضِ حقیقت پہ نقش آرائی
خیال میں نہ رہا رنگِ ماسوا باقی

بڑا غضب یہ دلِ شعلہ آرزو نے کیا
کہ مدّعی کا پتہ ہے نہ مدّعا باقی

رہا نہ تارِ رگِ جاں میں ارتعاشِ خفی
نہ اَب وہ نغمۂ بے لفظ و بے صدا باقی

خبر نہیں ہے کہ کیا حال ہے کہاں ہوں میں
بقا کا ہوش نہ اَب مستیٔ فنا باقی

جو سب لیا ہے تو یہ سوز و ساز بھی لے لے
یہی رہا ہے کہ اَب امتیاز بھی لے لے

مگر یہ دل میں جو شعلہ سا تھرتھراتا ہے
نگاہِ لطف کا شاید ہے آسرا باقی

جو کچھ نہیں، نہ سہی، دِل تو خون ہوتا ہے
کہ عشق کی ہے ابھی شانِ ارتقا باقی

مزہ الم میں ہے کچھ لطف خستگی میں ہے
غرضکہ نشو و نما رُوح کی اِسی میں ہے

غزلیات

ادنیٰ سایہ حیرت کا کرشمہ نظر آیا
جو تھا پسِ پردہ، سرِ پردہ نظر آیا

پھر میں نظر آیا، نہ تماشا نظر آیا
جب تُو نظر آیا مجھے، تنہا نظر آیا

اللہ رے دیوانگیٔ شوق کا عالم
اِک رقص میں ہر ذرّہ صحرا نظر آیا

اُٹھے عجب انداز سے وہ جوشِ غضب میں
چڑھتا ہُوا اِک حُسن کا دریا نظر آیا

کس درجہ ترا حُسن بھی آشوبِ جہاں ہے
جس ذرّے کو دیکھا وہ تڑپتا نظر آیا

اب خود ترا جلوہ جو دکھائے، وہ دکھا دے
یہ دیدۂ بینا تو تماشا نظر آیا

تھا لطفِ جنُوں دیدۂ خوں نابہ فشاں سے
پھُولوں سے بھرا دامنِ صحرا نظر آیا

دل نثارِ مصطفیٰ جاں پائمالِ مصطفیٰ
یہ اویسِ مصطفیٰ ہے، وہ بلالِ مصطفیٰ

دونوں عالم تھے مرے حرفِ دعا میں غرق و محو
بس خُدا سے کہہ رہا تھا جب سوالِ مصطفیٰ

سب سمجھتے ہیں اسے شمعِ شبستانِ حرا
نُور ہے کونین کا لیکن جمالِ مصطفیٰ

عالمِ ناسوت میں اور عالمِ لاہوت میں
کوندتی ہے ہر طرف برقِ جمالِ مصطفیٰ

عظمتِ تنزیہہ دیکھی، شوکتِ تشبیہہ بھی
ایک حالِ مصطفیٰ ہے، ایک قالِ مصطفیٰ

دیکھئے کیا حال کر ڈالے شبِ یلدائے غم
ہاں نظر آئے ذرا صُبحِ جمالِ مصطفیٰ

ذرّہ ذرّہ عالمِ ہستی کا روشن ہوگیا
اللہ اللہ شوکت و شانِ جمالِ مصطفےٰ

خوب دن تھے ابتدائے عشق کے
اب دماغِ نالہ و شیون کہاں

اس رخِ رنگیں سے آنکھیں سینکیے
ڈھونڈھیے اب آتشِ ایمن کہاں

سارے عالم میں کیا تجھ کو تلاش
تو ہی بتلا، ہے رگِ گردن کہاں

خوب تھا صحرا، پر اے ذوقِ جنوں،
پھاڑنے کو نت نئے دامن کہاں

شوق سے ہے ہر رگِ جاں جست میں
لے اُڑے گی بوئے پیراہن کہاں

حیران ہے زاہد مری مستانہ ادا سے
سو راہِ طریقت کھلیں اک لغزشِ پا سے

اک صورتِ افتادگیٔ نقشِ فنا ہوں
اب راہ سے مطلب نہ مجھے راہنما سے

میخانہ کی اک روح مجھے کھینچ کے دے دی
کیا کر دیا ساقی! نگہِ ہوش ربا سے

فتنہ سامانیوں کی خو نہ کرے
مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے

پہلے ہستی کی ہے تلاش ضرور
پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے

ماورائے سخن بھی ہے کچھ بات
بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

وہ اک دل و دماغ کی شادابیٔ نشاط
گرنا چمک کے اُف! تری برقِ نگاہ کا

وہ لذتِ الم کا جو خوگر سمجھ گئے
اب ظلم مجھ پہ ہے ستمِ گاہ گاہ کا

شیشے میں موجِ مے کو یہ کیا دیکھتے ہیں آپ
اس میں جواب ہے اسی برقِ نگاہ کا

عشق ہی سعی مری، عشق ہی حاصل مرا
یہی منزل ہے، یہی جادۂ منزل میرا

یوں اڑا لے جاتا ہے مجھے دل میرا
ساتھ دیتا نہیں اب جادۂ منزل میرا

اور آجائے نہ زندانیٔ وحشت کوئی
ہے جنوں خیز بہت شورِ سلاسل میرا

میں سراپا ہوں تمنّا ہمہ تن درد ہوں میں
ہر بنِ مو میں تڑپتا ہے مرے دل میرا

داستاں اُن کی اداؤں کی ہے رنگیں، لیکن
اس میں کچھ خونِ تمنّا بھی ہے شامل میرا

بے نیازی کو تری کچھ بھی پذیرا نہ ہوا
شکرِ اخلاص مرا، شکوۂ باطل میرا

ہے ایک ہی جلوہ جو اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
آئینہ بھی حیران ہے و آئینہ نگر بھی

ہو نور پہ کچھ اور ہی اک نور کا عالم
اس رُخ پہ جو چھا جائے مرا کیفِ نظر بھی

تھا حاصلِ نظارہ فقط ایک تحیّر
جلوے کو کہے کون کہ اب گم ہے نظر بھی

اب تو یہ تمنّا ہے کسی کو بھی نہ دیکھوں
صورت جو دکھا دی ہے تو لے جاؤ نظر بھی

مستی میں فروغِ رُخِ جاناں نہیں دیکھا!
سُنتے ہیں بہار آئی، گلستاں نہیں دیکھا

زاہد نے مرا حاصلِ ایماں نہیں دیکھا
رُخ تری زُلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پُر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی رُوئے شبِ ہجراں نہیں دیکھا

کچھ دعویٔ تمکیں ہیں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

رُودادِ چمن سُنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

مجھ خستہ و مہجور کی آنکھیں ہیں ترستی
کب سے تجھے اے سروِ خراماں نہیں دیکھا

کیا کیا ہُوا ہنگامِ جنوں، یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

شائستۂ صحبت کوئی اُن میں نہیں اصغر
کافر نہیں دیکھے کہ مسلماں نہیں دیکھا

رُخِ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی
شعاعیں کیا پڑیں، رنگت نکھر آئی گلستاں کی

یہیں پر ختم ہو جاتی ہیں بخشیں کفر و ایماں کی
نقاب اُس نے اُلٹ کر یہ حقیقت ہم پہ عُریاں کی

روانی رنگ لائی دیدۂ خوں نابہ افشاں کی
اُتر آئی ہے اِک تصویر دامن پر گلستاں کی

حقیقت کھول دیتا میں جنوں کے رازِ پنہاں کی
قسم دے دی ہے لیکن قیس نے چاکِ گریباں کی

مری اک بیخودی میں سینکڑوں ہوش و خرد گم ہیں
یہاں کے ذرہ ذرہ میں ہے وسعت اِک بیاباں کی

مجھی سے بگڑے رہتے ہیں مجھی پر ہے عتاب اُن کا
ادائیں چھپ نہیں سکتیں نوازِ شہائے پنہاں کی

اسیرانِ بلا نے آہ کچھ اس درد سے کھینچی
نگہباں چیخ اُٹھے، ہل گئی دیوارِ زنداں کی

نگاہِ یاس و آہِ عاشقاں و نالۂ بلبل
معاذ اللہ کتنی صورتیں ہیں اُنکے پیکاں کی

اسیرانِ بلا کی حسرتوں کو آہ کیا کہیئے
تڑپ کے ساتھ اُونچی ہو گئی دیوارِ زنداں کی

اِدھر وہ خندۂ گلہائے رنگیں صحنِ گلشن میں
اُدھر اِک آگ لگ جانا وہ بلبل کے نشیمن میں

بنی آئی بادہ نوشوں کی بہار آئی ہے گلشن میں
لبِ جوڈھل رہی ہے بھر لئے ہیں پھول دامن میں

تپش جو شوق میں تھی اصل میں بھی ہے وہی مجھکو
چمن میں بھی وہی اِک آگ ہے جو تھی نشیمن میں

مری وحشت پہ بحث آرائیاں اچھی نہیں ناصح
بہت سے باندھ رکھے ہیں گریباں ہیں نے دامن میں

الٰہی کون سمجھے میری آشفتہ مزاجی کو
قفس میں چین آتا ہے نہ راحت ہے نشیمن میں

بہار آتے ہی وہ اک بارگی میرا تڑپ جانا
وہ جا پڑنا قفس کا آپ سے آپ اُڑ کے گلشن میں

ابھی اِک موجِ مے اٹھی تھی میخانے میں آ واعظ
ابھی اِک برق سی چمکی تھی مرے وادیٔ ایمن میں

عشووں کی ہے نہ اس نگہِ فتنہ زا کی ہے
ساری خطا مرے دلِ شورش ادا کی ہے

مستانہ کر رہا ہوں رہِ عاشقی کو طے
کچھ ابتدا کی ہے نہ خبر انتہا کی ہے

کِھلتے ہی پھول باغ میں پژمردہ ہو چلے
جُنبش رگِ بہار میں موجِ فنا کی ہے

ہم خستگانِ راہ کو راحت کہاں نصیب
آواز کان میں ابھی بانگِ درا کی ہے

ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوشِ آرزو
اب تو یہی زبان مرے مدعا کی ہے

لُطفِ نہانِ یار کا مشکل ہے امتیاز
رنگت چڑھی ہوئی ستمِ برملا کی ہے

جلوۂ رنگیں اُتر آیا نگاہِ شوق میں
ہم لطافت جسم کی اے سیم تن دیکھا کیے

شیوۂ منصور تھا اہلِ نظر پر بھی گراں
پھر بھی کس حسرت سے سب دار و رسن دیکھا کیے

دشتِ غربت کی طرف اِک آہ بھر کر حسرت کی
گرد کو پہروں مری اہلِ وطن دیکھا کیے

بُلبُل و گُل میں جو گزری، ہم کو اس سے کیا غرض
ہم تو گلشن میں فقط رنگِ چمن دیکھا کیے

دوڑتے پھرتے تھے جلوے اُن کے موجِ نور میں
دُور سے ہم راتِ شمعِ انجمن دیکھا کیے

شعورِ غم نہ ہو، فکرِ مآلِ کار نہ ہو
قیامتیں بھی گزر جائیں ہوشیار نہ ہو

وہ دستِ ناز جو معجز نمائیاں نہ کرے
لحد کا پھول چراغِ سرِ مزار نہ ہو

اُٹھاؤں پردہ ہستی جو ہو جہاں نہ خراب
سُناؤں رازِ حقیقت جو خوفِ دار نہ ہو

ہر اک جگہ تری برقِ نگاہ دوڑ گئی
غرض یہ ہے کہ کسی چیز کو قرار نہ ہو

یہ دیکھتا ہوں ترے زیرِ لب تبسّم کو
کہ بحرِ حُسن کی اِک موجِ بے قرار نہ ہو

خزاں میں بُلبُلِ بیکس کو ڈھونڈیئے چل کر
وہ برگِ خشک کہیں زیرِ شاخسار نہ ہو

سمجھ میں برقِ سرِ طور کس طرح آئے؟
جو موجِ بادہ میں ہیجان و اِنتشار نہ ہو

دکھا دے بیخودیٔ شوق وہ سماں مجھ کو
کہ صبحِ وصل نہ ہو، شامِ انتظار نہ ہو

نگاہِ شوق کو یارائے سیر و دید کہاں؟
جو ساتھ ساتھ تجلّیٔ حُسنِ یار نہ ہو

ذرا سے پردۂ محمل کی کیا حقیقت تھی؟
غبارِ قیس کہیں خود ہی پردہ دار نہ ہو!

اُس کا وہ قدِ رعنا، اُس پر وہ رُخِ رنگیں
نازک سا سرِ شاخ اِک گویا گلِ تر دیکھا

تم سامنے کیا آئے، اِک طرفہ بہار آئی
آنکھوں نے مری گویا فردوسِ نظر دیکھا

ہر ذرّے میں صحرا کے بے تاب نظر آئی
لیلیٰ کو بھی مجنوں نے یوں خاک بسر دیکھا

مستی سے ترا جلوہ خود غرضِ تماشا ہے
آشفتہ مزاجوں کا یہ کیفِ نظر دیکھا

ہاں وادیٔ ایمن کے معلوم ہیں سب قصّے
موسیٰ نے فقط اپنا اِک ذوقِ نظر دیکھا

کون تھا اُسکے ہوا خواہوں میں جو شامل نہ تھا
اب ہُوا معلوم مجھ کو، دِل بھی میرا دل نہ تھا

عشق کی بیتابیوں پر حُسن کو رحم آگیا
جب نگاہِ شوق تڑپی، پردۂ محمل نہ تھا

تھیں نگاہِ شوق کی رنگینیاں چھائی ہُوئی
پردۂ محمل اُٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا

قہر ہے تھوڑی سی بھی غفلت طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

اک عالمِ حیرت ہے، فنا ہے نہ بقا ہے — حیرت بھی یہ حیرت ہے کہ کیا جانیئے کیا ہے
سَو بار جلا ہے، تو یہ سو بار بنا ہے — ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بَلا ہے
ہونٹوں پہ تبسم ہے کہ اِک برقِ بلا ہے — آنکھوں کا اشارہ ہے کہ سیلابِ فنا ہے
سُنتا ہُوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی — کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے
ہے تیرے تصور سے یہاں نُور کی بارش — یہ جانِ حزیں ہے کہ شبستانِ حرا ہے

ایک مُشتِ خاک کا کیا ہو بیانِ اضطراب — ذرّے ذرّے میں نہاں ہے، اِک جہانِ اضطراب
جانتے ہیں وہ ادائیں اس دلِ بیتاب کی — ان سے بڑھ کر کون ہوگا نکتہ دانِ اضطراب
ناصحِ مشفق! اگر یُونہی تڑپنے دے مجھے — مجھ کو بھی معلوم ہے سُود و زیانِ اضطراب
ذرّے ذرّے کو ہے جُنبش ان کے برقِ حُسن سے — اُڑ نہ جائے ایک دن یہ خاکدانِ اضطراب
دونوں عالم کو تہ و بالا نہ کر ڈالیں کہیں — آپ کا اندازِ شوخی، میری شانِ اضطراب
کس نے پہلو میں مرے لا کر بٹھایا ہے تجھے — او دلِ شوریدہ! او آفت نشانِ اضطراب

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے — ہم مر کے کیا کریں گے، کیا کر لیا ہے جی کے
محسوس ہو رہے ہیں بادِ فنا کے جھونکے — کُھلنے لگے ہیں مجھ پر اسرار زندگی کے
شرح و بیانِ غم ہے اک مطلبِ مُقیّد — خاموش ہوں کہ معنی صد ہا ہیں خامشی کے
بارِ الم اُٹھایا رنگِ نشاط دیکھا — آئے نہیں ہیں یُونہی اندازِ بے حسی کے

تسکیں بقدرِ حوصلۂ دل نظر میں ہے — جلوہ تمہارا ذوقِ طلب کے اثر میں ہے

اِک عالمِ حیرت ہے، فنا ہے نہ بقا ہے
حیرت بھی یہ حیرت ہے کہ کیا جانیئے کیا ہے

سَو بار جلا ہے، تو یہ سو بار بنا ہے
ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بَلا ہے

ہونٹوں پہ تبسم ہے کہ اِک برقِ بلا ہے
آنکھوں کا اشارہ ہے کہ سیلابِ فنا ہے

سُنتا ہُوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی
کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

ہے تیرے تصوّر سے یہاں نُور کی بارش
یہ جانِ حزیں ہے کہ شبستانِ حرا ہے

ایک مُشتِ خاک کا کیا ہو بیانِ اضطراب
ذرّے ذرّے میں نہاں ہے، اِک جہانِ اضطراب

جانتے ہیں وہ ادائیں اس دلِ بیتاب کی
ان سے بڑھ کر کون ہوگا نکتہ دانِ اضطراب

ناصحِ مشفق! اگر یُونہی تڑپنے دے مجھے
مجھ کو بھی معلوم ہے سُود و زیانِ اضطراب

ذرّے ذرّے کو ہے جُنبش اُن کے برقِ حُسن سے
اُڑ نہ جائے ایک دن یہ خاکدانِ اضطراب

دونوں عالم کو تہ و بالا نہ کر ڈالیں کہیں
آپ کا اندازِ شوخی، میری شانِ اضطراب

کس نے پہلو میں مرے لا کر بٹھایا ہے تجھے
او دلِ شوریدہ! او آفت نشانِ اضطراب

یہ بھی فریب سے ہیں کچھ دردِ عاشقی کے
ہم مر کے کیا کریں گے، کیا کر لیا ہے جی کے

محسوس ہو رہے ہیں بادِ فنا کے جھونکے
کُھلنے لگے ہیں مجھ پر اسرار زندگی کے

شرح و بیانِ غم ہے اِک مطلبِ مُقیّد
خاموش ہوں کہ معنی صد ہا ہیں خامشی کے

بارِ الم اُٹھایا رنگِ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یُونہی انداز بے حِسی کے

تُمکی بقدرِ حوصلۂ دل نظر میں ہے
جلوہ تمہارا ذوقِ طلب کے اثر میں ہے

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز اب کہاں؟ — رعشہ سا کچھ ضرور ابھی بال و پر میں ہے
تم باخبر ہو چلنے والوں کے حال سے — سب کی نظر کا راز تمہاری نظر میں ہے
تقدیر کس کے خرمنِ ہستی کی کھل گئی! — طوفان بجلیوں کا تمہاری نظر میں ہے
مجھ کو جلا کے گلشنِ ہستی نہ پھونک دے — وہ آگ جو دبی ہوئی مجھ مشتِ پر میں ہے

ہر ادائے حسن آئینے میں آتی ہے نظر — یعنی خود کو دیکھتے ہیں مجھ کو حیراں دیکھ کر
ذرّے ذرّے سے نمایاں ہے تجلّی کا قدم — ہوش گم ہیں وسعتِ صحرائے امکاں دیکھ کر
کچھ غنیمت ہو گئے یہ پردہ ہائے رنگ و رنگ — حسن کو یوں کون رہ سکتا تھا عریاں دیکھ کر
بے تکلف ہو کے مجھ سے سب اٹھا ڈالے حجاب — شاہدِ دیر و حرم نے مست و حیراں دیکھ کر
آج خون گشتہ تمنّائیں مجھے یاد آ گئیں — ہر طرف ہنگامۂ جوشِ بہاراں دیکھ کر
گر پڑی خود روح قیدِ عنصری میں ٹوٹ کر — لذّتِ ذوقِ فنا ہر سو فراواں دیکھ کر

پھر گئی آنکھوں کے نیچے وہ ادائے برقِ حسن
چیخ اٹھے سب مرا چاک گریباں دیکھ کر

تیرے جلووں کے آگے ہمت شرح و بیاں رکھ دی — زبانِ بے نگہ رکھ دی، نگاہِ بے زبان رکھ دی
مٹی جاتی تھی بلبل جلوۂ گلہائے رنگیں پر — چھپا کر کس نے ان پردوں میں برقِ آشیاں رکھ دی
نیازِ عشق کو سمجھا ہے کیا اے واعظِ ناداں! — ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھ دی
قفس کی یاد میں یہ اضطرابِ دل، معاذ اللہ! — کہ میں نے توڑ کر ایک ایک شاخِ آشیاں رکھ دی
کرشمے حسن کے پنہاں تھے شاید رقصِ بسمل میں — بہت کچھ سوچ کر ظالم نے تیغِ خوں فشاں رکھ دی

الٰہی! کیا کیا تو نے کہ عالم میں تلاطم ہے
غضب کی ایک مشتِ خاک زیرِ آسماں رکھ دی

گرمِ تلاش و جستجو اب ہے تری نظر کہاں؟ | خون ہے کچھ جما ہوا، قلب کہاں، جگر کہاں؟
ہے یہ طریقِ عاشقی، چاہیئے اس میں بیخودی | اس میں چناں چنیں کہاں، اس میں اگر مگر کہاں؟
زلف تھی جو بکھر گئی، رُخ تھا کہ جو نکھر گیا | ہائے وہ شام اب کہاں، ہائے وہ اب سحر کہاں؟
کیجئے آج کس طرح دوڑ کے سجدۂ نیاز | یہ بھی تو ہوش اب نہیں، پاؤں کہاں ہے، سر کہاں؟
ہائے وہ دن گذر گئے جوششِ اضطراب کے | نیند قفس میں آگئی، اب غمِ بال و پر کہاں؟

ہوش و خرد کے پھیر میں عمرِ عزیز صرف کی
رات تو کٹ گئی یہاں، دیکھیے ہو سحر کہاں؟

صرف اک سوز تو مجھ میں ہے مگر ساز نہیں | میں فقط درد ہوں جس میں کوئی آواز نہیں
مجھ سے جو چاہیئے، وہ درسِ بصیرت لیجئے | میں خود آواز ہوں میری کوئی آواز نہیں
وہ مزے ربطِ نہانی کے کہاں سے لاؤں | ہے نظر مجھ پہ، مگر اب غلط انداز نہیں
پھر یہ سب شورشِ و ہنگامۂ عالم کیا ہے؟ | اسی پردے میں اگر حسنِ جنوں ساز نہیں

آتشِ جلوۂ محبوب نے سب پھونک دیا
اب کوئی پردہ نہیں، پردہ بر انداز نہیں

اسرارِ عشق ہے دلِ مضطر لئے ہوئے | قطرہ ہے بے قرار سمند ر لئے ہوئے

آشوبِ دہر و فتنۂ محشر لئے ہوئے
پہلو میں یعنی ہوں دلِ مضطر لئے ہوئے

موجِ نسیمِ صبح کے قربان جایئے
آئی ہے بوئے زلفِ معنبر لئے ہوئے

کیا مستیاں چمن میں ہیں جوشِ بہار سے
ہر شاخِ گل ہے ہاتھ میں ساغر لئے ہوئے

قاتل نگاہِ یاس کی زد سے نہ بچ سکا!
خنجر تھے ہم بھی اِک تہِ خنجر لئے ہوئے

خیرہ کئے ہے چشمِ حقیقت شناس بھی
ہر ذرّہ ایک مہرِ منوّر لئے ہوئے

پہلی نظر بھی آپ کی اُف کس بلا کی تھی
ہم آج تک وہ چوٹ ہیں دل پر لئے ہوئے

تصویر ہے کھنچی ہوئی ناز و نیاز کی
مَیں سر جھکائے اور وہ خنجر لئے ہوئے

صہبائے تند و تیز کو ساقی سنبھالنا
اُچھلے کہیں نہ شیشہ و ساغر لئے ہوئے

میں کیا کہوں، کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

نام اُن کا آگیا کہیں ہنگامِ بازپُرس
ہم تھے کہ اُڑ گئے صفِ محشر لئے ہوئے

اصغرؔ حریمِ عشق میں ہستی ہی جُرم ہے
رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لئے ہوئے

نہ یہ شیشہ، نہ یہ ساغر، نہ یہ پیمانہ بنے
جانِ میخانہ تری نرگسِ مستانہ بنے

مرتے مرتے نہ کبھی عاقل و فرزانہ بنے
ہوش رکھنا ہو جو انسان تو دیوانہ بنے

پرتوِ رُخ کے کرشمے تھے سرِ راہ گذر
ذرّے جو خاک سے اُٹھے، وہ صنم خانہ بنے

موجِ صہبا سے بھی بڑھ کر ہوں ہوا کے جھونکے
ابر یُوں جھوم کے چھا جائے کہ میخانہ بنے

کارفرما ہے فقط حُسن کا نیرنگِ کمال
چاہے وہ شمع بنے، چاہے وہ پروانہ بنے

چھوڑ کر یوں درِ محبوب چلا صحرا کو
ہوش میں آئے ذرا قیس، نہ دیوانہ بنے

خاک پروانہ کی برباد نہ کر، بادِ صبا
یہی ممکن ہے کہ کل تک مرا افسانہ بنے

جرعۂ مے تری مستی کی ادا ہو جائے
موجِ صہبا تری ہر لغزشِ مستانہ بنے

اُس کو مطلوب ہیں کچھ قلب و جگر کے ٹکڑے
جیب و دامن نہ کوئی پھاڑ کے دیوانہ بنے

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

گم کر دیا ہے دید نے یوں سر بسر مجھے
ملتی ہے اب انہیں سے کچھ اپنی خبر مجھے

نالوں سے میں نے آگ لگا دی جہان میں
صیاد جانتا تھا فقط مشتِ پر مجھے

اللہ رے اُنکے جلوے کی حیرت فزائیاں!
یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے

مانا حریمِ ناز کا پایہ بلند ہے
لے جائے گا اُچھال کے دردِ جگر مجھے

ایسا کہ بُت کدے کا جسے راز ہو سپرد
اہلِ حرم میں کوئی نہ آیا نظر مجھے

کیا دردِ ہجر اور یہ کیا لذتِ وصال
اس سے بھی کچھ بلند ملی ہے نظر مجھے

مستِ شباب وہ ہیں، میں سرشارِ عشق ہوں
میری خبر انہیں ہے نہ اُن کی خبر مجھے

جب اصل اس مجاز و حقیقت کی ایک ہے
پھر کیوں پھرا رہے ہیں اِدھر سے اُدھر مجھے

سامنے اُن کے تڑپ کر اس طرح فریاد کی
میں نے پوری شکل دکھلا دی دلِ ناشاد کی

اب یہی ہے وجہ تسکیں خاطرِ ناشاد کی
زندگی میں نے دیارِ حُسن میں برباد کی

ہوش پر بجلی گری، آنکھیں بھی خیرہ ہو گئیں
تم تو کیا تھے اِک جھلک سی تھی تمہاری یاد کی

چل دیا مجنوں تو صحرا سے کسی جانب مگر
اِک صدا گونجی ہوئی ہے نالہ و فریاد کی

نغمۂ پُر درد چھیڑا ایس نے اس انداز سے
خود بخود مجھ پر نظر پڑنے لگی صیاد کی

دِل ہُوا مجبور جس دم اشکِ حسرت بن گیا
رُوح جب تڑپی تو صورت بن گئی فریاد کی

اس حریمِ قدس میں کیا لفظ و معنی کا گزر
پھر بھی سب باتیں پہنچتی ہیں لبِ فریاد کی

تمتما اُٹھے وہ عارض میرے عرضِ شوق پر
حُسن جاگ اُٹھا وہیں جب عشق نے فریاد کی

آشیاں میں اب کسی صورت نہیں پڑتا ہے چین
تھی نظر تاثیر میں ڈوبی ہوئی صیاد کی

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیّل چاہیئے
مجھ کو اصغرؔ کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

یہ کیا کہا کہ غمِ عشق ناگوار ہُوا
مجھے تو جُرعۂ تلخ اور سازگار ہُوا

شرشکِ شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز
اُچھالنا تھا کہ اِک بحرِ بے کنار ہُوا

ادائے عشق کی تصویر کھنچ گئی پوری
وفورِ جوش سے یوں حُسن بے قرار ہُوا

بہت لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے
نہ میں ہُوا کبھی بیخود، نہ ہوشیار ہُوا

لئے پھری نگہِ شوق سارے عالم میں
بہت ہی جلوۂ حُسن آج بے قرار ہُوا

جہاں بھی میری نگاہوں سے ہو چلا معدوم
ارے بڑا غضب، اے چشمِ سحر کار! ہُوا

مری نگاہوں نے جُھک جُھک کے کر دیئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حُسنِ یار ہُوا

ذوقِ سرمستی کو محوِ رُوئے جاناں کر دیا
کُفر کو اس طرح چمکایا کہ ایماں کر دیا

چل دیا جُنوں تو صحرا سے کسی جانب مگر
اِک صدا گونجی ہوئی ہے نالہ و فریاد کی

نغمۂ پُر درد چھیڑا یَس نے اس انداز سے
خود بخود مجھ پر نظر پڑنے لگی صیاد کی

دِل ہُوا مجبُور جس دم اشکِ حسرت بن گیا
رُوح جب تڑپی تو صورت بن گئی فریاد کی

اس حریمِ قدس میں کیا لفظ و معنی کا گزر
پھر بھی سب باتیں پہنچتی ہیں لبِ فریاد کی

تمتما اُٹھے وہ عارض میرے عرضِ شوق پر
حُسن جاگ اُٹھا وہیں جب عشق نے فریاد کی

آشیاں میں اب کسی صورت نہیں پڑتا ہے چین
تھی نظر تاثیر میں ڈوبی ہوئی صیاد کی

شعر میں رنگینیٔ جوشِ تخیّل چاہیئے
مجھ کو اصغرؔ کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

یہ کیا کہا کہ غمِ عشق ناگوار ہُوا
مجھے تو جُرعۂ تلخ اور سازگار ہُوا

شرشکِ شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز
اُچھالنا تھا کہ اِک بحرِ بے کنار ہُوا

ادائے عشق کی تصویر کھنچ گئی پوری
وفورِ جوش سے یُوں حُسن بے قرار ہُوا

بہت لطیف اشارے تھے چشمِ ساقی کے
نہ میں ہُوا کبھی بیخود، نہ ہوشیار ہُوا

لئے پھری نگہِ شوق سارے عالم میں
بہت ہی جلوۂ حُسن آج بے قرار ہُوا

جہاں بھی میری نگاہوں سے ہو چلا معدوم
ارے بڑا غضب، اے چشمِ سحر کار! ہُوا

مری نگاہوں نے جُھک جُھک کے کر دیئے سجدے
جہاں جہاں سے تقاضائے حُسنِ یار ہُوا

ذوقِ سرمستی کو محوِ رُوئے جاناں کر دیا
کُفر کو اس طرح چمکایا کہ ایماں کر دیا

تُو نے یہ اعجاز کیا اے سوزِ پنہاں! کر دیا
اس طرح پھونکا کہ آخر جسم کو جاں کر دیا

جس پہ میری جستجو نے ڈال رکھے تھے حجاب
بیخودی نے اب اُسے محسوس و عُریاں کر دیا

کچھ نہ ہم سے ہو سکا اس اضطرابِ شوق میں
اُن کے دامن کو مگر اپنا گریباں کر دیا

گو نہیں رہتا کبھی پردے میں رازِ عاشقی
تُم نے چھُپ کر اور بھی اس کو نمایاں کر دیا

رکھ دیئے دیر و حرم سر مارنے کے واسطے
بندگی کو بے نیازِ کفر و ایماں کر دیا

عارضِ نازک پہ اُن کے رنگ سا کچھ آ گیا
اِن گُلوں کو چھیڑ کر ہم نے گلستاں کر دیا

اِن بُتوں کی صورتِ زیبا کو اصغرؔ کیا کہوں
پر خُدا نے، وائے ناکامی! مسلماں کر دیا

ہوش کسی کا بھی نہ رکھ جلوہ گہِ نماز میں
بلکہ خُدا کو بھُول جا، سجدۂ بے نیاز میں

رازِ نشاطِ خُلد ہے خندۂ دل نواز میں
غیب و شہود کے رموز نرگسِ نیم باز میں

آج تو اضطرابِ شوق حد سے سوا گزر گیا
اور بھی جان پڑ گئی عشوۂ جاں گداز میں

اس سے زیادہ اور کیا شوخیٔ نقشِ پا کہوں؟
برق سی اک چمک گئی آج سرِ نیاز میں

آتشِ گُل سے ہر طرف دشت و چمن دہک اُٹھا
ایک شرارِ طور ہے خلوتیانِ راز میں

ہوش و خرد کے ساتھ ساتھ جانِ حزیں بھی سوختہ ہے
آگ سی ہے بھری ہوئی سینۂ نے نواز میں

پردۂ دہر کچھ نہیں، ایک ادائے شوخ ہے
خاک اُٹھا کے ڈال دی دیدۂ امتیاز میں

اے دلِ شوخ و حیلہ جُو، زیر کمیں رنگ و بُو
طائرِ قدس کو بھی لے دامگہِ مجاز میں

سب ہے ادائے بیخودی، ورنہ ادائے حُسن کیا
ہوش کا جب گذر نہیں اس کی حریمِ ناز میں

جو شجر باغ میں ہے، وہ شجرِ طُور ہے آج
پتّے پتّے میں جو دیکھا تو وہی نُور ہے آج

شورشِ دل جو وہ ہوتی تھی، بدستور ہے آج
نہیں معلوم وہ نزدیک ہے، یا دُور ہے آج

فصلِ گل، جوشِ نمو، طلعتِ زیبائے بہار
عرضِ دیدار بہ یک جلوۂ مستُور ہے آج

مَیں نے خاکسترِ دل میں نہیں دیکھا جس کو
وہی ذرّہ تو ہے جو برقِ سرِ طُور ہے آج

نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں
خون میں گرمیٔ ہنگامۂ منصُور ہے آج

جس سے کل تک دلِ بے تاب پُھنکا جاتا تھا
اُسی شعُلہ کو جو دیکھا تو سرِ طُور ہے آج

سب گھیر لیا جلوۂ حُسنِ بشری نے
پایا ہے سرِ عرش بھی سیر نظری نے

اُفتادگیٔ راہ کی منزل کو نہ سمجھا
آخر نہ دیا ساتھ مرا ہم سفری نے

اس جلوۂ بے کیف سے محروم ہی رکھا
کمبخت کبھی ہوش، کبھی بے خبری نے

کس شان سے پردے کو ہٹایا ہے تڑپ کر
ناکامیٔ پُر دردِ حجابِ بشری نے

آنکھوں میں تیری بزمِ تماشا لئے ہوئے
جنّت میں بھی ہوں جنّتِ دُنیا لئے ہوئے

پاسِ ادب میں جوشِ تمنّا لئے ہوئے
مَیں بھی ہوں اک حباب میں دریا لئے ہوئے

کس طرح حُسنِ دوست ہے بے پردہ آشکار
صد ہا حجابِ صورت و معنیٰ لئے ہوئے

ہے آرزو کہ آئے قیامت ہزار بار
فتنہ طرازیٔ قدِ رعنا لئے ہوئے

طوفانِ ناز، اور پریشاں غبارِ قیس
شانِ نیاز محملِ لیلیٰ لئے ہوئے

پھر دل میں التفات ہُوا اُن کے جاگزیں
اِک طرزِ خاص رنجشِ بیجا لئے ہوئے

پھر اِن لبوں پہ موجِ تبسّم ہوئی عیاں
سامانِ جوشِ رقصِ تمنّا لئے ہوئے

صُوفی کو ہے مشاہدۂ حق کا اِدّعا
صد ہا حجابِ دیدۂ بینا لئے ہوئے

صد ہا تو لطفِ خاص سے بھی محروم رہ گئے
یہ امتیازِ سلغر و مینا لئے ہوئے

مجھ کو نہیں ہے تابِ خلشہائے روزگار
دِل ہے نزاکتِ غمِ لیلیٰ لئے ہوئے

تُو برقِ حُسن اور تجلّی سے یہ گریز
مَیں خاک اور ذوقِ تماشا لئے ہوئے

اُفتادگانِ عشق نے سَر اَب تو رکھ دیا
اُٹھیں گے بھی تو نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

رگ رگ میں اور کچھ نہ رہا جُز خیالِ دوست
اس شوخ کو ہوں آج سراپا لئے ہوئے

دل مبتلا و مائلِ تمکین اِتّفا!
جامِ شرابِ نرگسِ رُسوا لئے ہوئے

سرمایۂ جبلّت ہے حیرانِ عاشقی
ہے ساتھ ایک صورتِ زیبا لئے ہوئے

جوشِ جنوں میں چھُوٹ گیا آستانِ یار
روتے ہیں مُنہ پہ دامنِ صحرا لئے ہوئے

اصغرؔ ہجومِ دردِ غریبی میں اُس کی یاد
آئی ہے اِک طلسمِ تمنّا لئے ہوئے

ہے دلِ ناکامِ عاشق میں تمہاری یاد بھی
یہ بھی کیا گھر ہے کہ ہے برباد بھی، آباد بھی

دِل کے مٹنے کا مجھے کچھ اور ایسا غم نہیں
ہاں مگر اتنا کہ ہے اس میں تمہاری یاد بھی

کِس کو یہ سمجھائیے نیرنگِ کارِ عاشقی
تھم گئے اشکِ مسلسل، رُک گئی فریاد بھی

سینے میں دردِ محبت راز بن کر رہ گیا
اب وہ حالت ہے کہ کر سکتے نہیں فریاد بھی

پھاڑ ڈالوں گا گریباں پھُولوں کا اپنا سَر
ہے مرے آفت کدے میں قیس بھی، فرہاد بھی

کچھ تو اصغرؔ مجھ میں ہے، قائم ہے جس سے زندگی
جان بھی کہتے ہیں اُس کو اور اُن کی یاد بھی

سرگرمِ تجلّی ہو، اے جلوۂ جانانہ!
اُڑ جائے دُھواں بن کر، کعبہ ہو کہ بُت خانہ

یہ دین، وہ دنیا ہے، یہ کعبہ، وہ بُت خانہ
اِک اور قدم بڑھ کر، اے ہمّتِ مردانہ

قُربان نرے میکش، ہاں اے نگہِ ساقی!
تُو صورتِ مستی ہے، تُو معنیٔ میخانہ

اب تک نہیں دیکھا ہے کہ اس رُخِ خنداں کو؟
اِک تارِ شعاعی سے اُلجھا ہے جو پروانہ

مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمیٔ حُسنِ شمع
اس سے بھی زیادہ ہے سوزِ غمِ پروانہ

زاہد کو تعجّب ہے، صُوفی کو تحیّر ہے
صد رشکِ طریقت ہے اِک لغزشِ مستانہ

اِک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا
یہ نیستی و ہستی، افسانہ ہے افسانہ

انداز ہیں جذب اس میں سب شمعِ شبستاں کے
اِک حُسن کی دُنیا ہے خاکسترِ پروانہ

ہر جُنبشِ نگاہ تری جانِ آرزو
موجِ خرامِ ناز ہے ایمانِ آرزو

جلوے تمام حُسن کے آکر سما گئے
اللہ رے یہ وسعتِ دامانِ آرزو

بس اِک چراغِ کُشتہ ہُوں شامِ فراق کا
تُو نو بہارِ صبحِ گلستانِ آرزو

اِس میں وہی ہیں یا مرا حُسنِ خیال ہے
دیکھوں اُٹھا کے پردۂ ایوانِ آرزو

اِک راز ہے تبسّمِ غم ناکِ ہجر میں
ہے اِک طلسمِ گریۂ خندانِ آرزو

اب طور پر وہ برقِ تجلّی نہیں رہی
تھرّا رہا ہے شعلۂ عُریانِ آرزو

اُس کی نگاہِ ناز نے چھیڑا کچھ اس طرح
اب تک اُچھل رہی ہے رگِ جانِ آرزو

اُس نوبہارِ ناز کی صورت کی ہُو بہُو
تصویر ایک ہے تہِ دامانِ آرزو

چاہا جہاں سے منظرِ فطرت بدل دیا
ہے گُل جہان تابعِ فرمانِ آرزو

کوثر کی موج تھی تری ہر جُنبشِ خرام
شاداب ہو گیا چمنستانِ آرزو

اس طرح چھیڑیئے افسانۂ ہجراں کوئی
آج ثابت نظر آئے نہ گریباں کوئی

جانِ بلبل کا خزاں میں نہیں پُرساں کوئی!
اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عُریاں کوئی

بے محابا ہوا گر حُسن تو وہ بات کہاں!
چُھپ کے جس شان سے ہوتا ہے نمایاں کوئی

خرمنِ گُل سے لپٹ کر وہیں مر جانا تھا
اب کرے کیوں گلۂ تنگیٔ داماں کوئی

کیا مرے حال پہ سچ مچ اُنہیں غم تھا قاصد!
تُو نے دیکھا تھا ستارہ سرِ مژگاں کوئی؟

اشکِ خونیں ہے کہیں، نالۂ رنگیں ہے کہیں
ہر قفس میں اُتر آتا ہے گُلستاں کوئی

پردۂ لالہ و گُل بھی ہے بلا کا خوں ریز
اب زیادہ نہ کرے حُسن کو عریاں کوئی

اپنے انداز پہ ہو شاہدِ فطرت بیخود
رکھ دے آئینہ اگر دیدۂ حیراں کوئی

کیا کرے زاہدِ بیچارہ، اُسے کیا معلوم؟
رحم کرتا ہے باندازۂ عصیاں کوئی

دِل میں اِک بُوند لہو کی نہیں، رونا کیسا
اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گُلستاں کوئی

شعلۂ طُور کو دیکھا ہے تو وجد کرتے
شب کو جب رقص میں آجاتا ہے عُریاں کوئی

دل کا ہر داغ ہے سرمایۂ رنگینیٔ حُسن
دیکھنا ہوگا اسی میں مہ کنعاں کوئی

لُطف ہر طرح کا ہے دشتِ جنوں میں لیکن
پھاڑنے کو نہیں مِلتا ہے گریباں کوئی

اب اِسے ہوش کہوں یا کہ جنوں، اے اصغرؔ
مجھ کو ہر تار میں ملتا ہے گریباں کوئی

پردۂ حرماں میں آخر کون ہے اس کے سوا
اے خوشا روئے کہ نزدیکی بھی ہے دُوری بھی ہے

حسرتِ ناکام میری، کام سے غافل نہیں
اِک طریقِ جستجو یہ دردِ مہجوری بھی ہے

مَیں تواِن مجبوریوں پہ بھی سراپا دید ہُوں
اُسکے جلوے کی ادا اِک شانِ مستوری بھی ہے

میری محرومی کے اندر سے یہ دی اُس نے صدا
قُرب کی راہوں میں میری آہ اِک دُوری بھی ہے

قلب پر اَب تک تڑپتی ہے شعاعِ برقِ طُور
خُون کے قطروں میں اب تک رقصِ منصُوری بھی ہے

تُو وہ قاتل ہے کہ ہر وار ترا رحمت ہے
مَیں وہ زخمی ہُوں کہ ہر زخم ہے اِک تازہ علاج

چشمِ پُر شوق کو گو حُسن سے پہنچی ہے ضیا
حُسن کا رنگ بھی ہے ذوقِ نظر کا محتاج

جس میں ہر روز نئے رنگ سے آتی تھی بہار
ہو گیا وہ چمنستانِ تمنا تاراج

فائدہ کیا کہ ترے عشق کو بدنام کروں
مَیں ازل ہی سے ہُوں دل رفتہ و وارستہ مزاج

انتہا دید کی یہ ہے کہ نہ کچھ آئے نظر
کیف بے رنگیٔ حیرت ہے نظر کی معراج

صاف کہتا ہے کہ میں کیا ہُوں فقط دریا ہے
کس قدر شوخ ہے ہر قطرۂ منصُور مزاج

ہے آتشِ بے تابی کچھ خرمنِ ہستی میں
اِک برقِ بلا بن کر تاثیرِ دُعا آئی

ہنگامِ سیہ مستی یہ فکرِ فلک پیما
ایک ایک ستارے کو آئینہ دکھا آئی

بیدار ہوا منظر اِس مست خرامی سے
غنچوں کی کھلیں آنکھیں، دامن کی ہوا آئی

اس عارضِ رنگیں پہ عالم وہ نگاہوں کا
معلوم یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

مجنوں کی نظر میں بھی شاید کوئی لیلیٰ ہے
ایک ایک بگولے کو دیوانہ بنا آئی

اِک شورِ انا لیلیٰ خلقت نے سُنا، لیکن
پھر نجد کے صحرا سے کوئی نہ صدا آئی

آج پھر حُسنِ حقیقت کو نمایاں کر دیں
ظلمتِ کُفر کو خالِ رُخِ ایماں کر دیں

نالۂ غم سے حقیقت کو نُمایاں کر دیں
نے کو اس طرح سے چھیڑیں کہ نیستاں کر دیں

بند ہو آنکھ، ہٹے منظرِ قُدرت کا حجاب
لاؤ اِک شاہدِ مستور کو عُریاں کر دیں

خاک کر دیں طپشِ عشق سے ساری ہستی
پھر اسی خاک کو خاکِ درِ جاناں کر دیں

رحمتِ حق نے بہت دیکھ لی طاعت کی بہار
اب ذرا سامنے رعنائیٔ عِصیاں کر دیں

لے لیا جائزۂ ہستیٔ عالم سارا
اُس پہ اب مُہر ترے دیدۂ حیراں کر دیں

دَیر کی راہ نہ ملتی، ہو تو کعبہ ہی سہی
کُفر جب کُفر نہ بنتا ہو تو ایماں کر دیں

جانِ بے تاب پہ وہ چوٹ تری یاد کی دیں
نفسِ بازِ پسیں کو بھی فروزاں کر دیں

پھر ہر اِک دردِ والم آج بنے وجہِ نشاط
دِل کے ہر داغ کو پھر شمعِ شبستاں کر دیں

نہ کھُلے عقدہائے ناز و نیاز
حُسن بھی راز اور عشق بھی راز

راز کی جستجو میں مرتا ہوں
اور میں خود ہوں ایک پردۂ راز

بال و پر ہیں مگر کہاں پائیں
بوئے گل یعنی ہمتِ پرواز

سازِ دل کیا ہُوا وہ ٹوٹا سا
ساری ہستی ہے گوش برآواز

لذتِ سجدۂ ہائے شوق نہ پوچھ
ہائے وہ اتصالِ ناز و نیاز

دیکھ رعنائی حقیقت کو
عشق نے بھر دیا ہے رنگِ مجاز

سازِ ہستی کا جائزہ کیسا!
تار کیا! دیکھ تار کی آواز

توڑ کر دستِ طلب محوِ رضا ہو جائے
سر سے پا تک ہمہ تن آپ دعا ہو جائے

وہ نظر اس کی جو ہے موجۂ صد روحِ حیات
مجھ تک آئے تو وہی تیرِ قضا ہو جائے

ہے تلوّن سے ترے جلوۂ نیرنگِ حیات
بس تو مر جاؤں جو امیدِ وفا ہو جائے

لالہ و گل پہ جو ہے قطرۂ شبنم کی بہار
رُخِ رنگیں پہ جو آئے تو حیا ہو جائے

پاتا نہیں جو لذتِ آہِ سحر کو میں
پھر کیا کروں گا لے کے الٰہی اثر کو میں

آشوب گاہِ حشر مجھے کیوں عجیب ہو
جب آج دیکھتا ہوں تری رہگذر کو میں

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا
اس رُخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

جینا بھی آگیا مجھے، مرنا بھی آگیا
پہچاننے لگا ہوں تمہاری نظر کو میں

وہ شوخیوں سے جلوہ دکھا کر تو چل دیے
اُن کی خبر کو جاؤں کہ اپنی خبر کو میں

آہوں نے میری خرمنِ ہستی جلا دیا
کیا منہ دکھاؤں گا تری برقِ نظر کو میں
باقی نہیں جو لذتِ بیداریٔ فنا
پھر کیا کروں گا زندگیٔ بے اثر کو میں

اصغرؔ مجھے جنوں نہیں، لیکن یہ حال ہے
گھبرا رہا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

کیا کیجئے جاں نوازیٔ پیکانِ یار کو
سیراب کر دیا دلِ منت گذار کو
جوشِ شباب و نشۂ صہبا، ہجومِ شوق
تعبیر یوں بھی کرتے ہیں فصلِ بہار کو
ہر ذرہ آئینہ ہے کسی کے جمال کا
یونہی نہ جانیئے مرے مشتِ غبار کو
میرے مذاقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ
میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو
ہاں اے نگارِ خوبی و اے جانِ دلبری
تو نے حیات بخشی ہے صبحِ بہار کو
اس جوئبارِ حسن سے سیراب ہے فضا
روکو نہ اپنی لغزشِ مستانہ دار لو
تھی بوئے دوست موجِ نسیمِ سحر کے ساتھ
یہ اور لے اڑی مری مشتِ غبار کو
یہ رازِ دل ہے، ہستیٔ گل کائنات ہے
دیکھیں حضورِ دیدۂ اُمیدوار کو
تیری ہی شوخیاں تھیں گرہ میں دبی ہوئی
چھیڑا جو میں نے موجِ نسیمِ بہار کو
کچھ اور ہی فضا دلِ بے مدعا کی ہے
دیکھا ہے روزِ وصل و شبِ انتظار کو

اصغرؔ نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

یوں نہ مایوس ہو اے شورشِ ناکام ابھی
میری رگ رگ میں ہے اک آتشِ بے نام ابھی

عاشقی کیا ہے؟ ہر اک شے سے تہی ہو جانا
اس سے ملنے کی ہے دل میں ہوسِ خام ابھی

انتہا کیف کی افتادگی و پستی ہے
مجھ سے کہتا تھا یہی دُردِ تہِ جام ابھی

علم و حکمت کی تمنا ہے نہ کونین کا غم
میرے شیشے میں ہے باقی مئے گلفام ابھی

سب مزے کر دیئے خورشیدِ قیامت نے خراب
میری آنکھوں میں تھا اک روئے دلارام ابھی

بُلبُلِ زار سے کو صحنِ چمن چھوٹ گیا
اس کے سینے میں ہے اک شعلۂ گلفام ابھی

نہ کچھ فنا کی خبر ہے، نہ ہے بقا معلوم
بس ایک بیخبری ہے سو وہ بھی کیا معلوم

ہُوا ہے دل کو مگر ننگِ آرزو لاحق!
خروشِ گریہ و بے تابیٔ دُعا معلوم

ہجومِ شوق میں اب کیا کہوں میں کیا نہ کہوں
مجھے تو خود بھی نہیں اپنا مُدّعا معلوم

غرض یہ ہے کسی عنواں تجھے کریں مائل
کہ شعبدہ سازیٔ ہر رند و پارسا معلوم

جبینِ شوق کی شوریدگی کو کیا کہیئے
وگرنہ عشوہ طرازیٔ نقشِ پا معلوم

نکھر کے تو اسی پردے میں جلوہ آرا ہے
بہارِ لالہ و گُل، شوخیٔ صبا معلوم

ستم جو چاہے کرے لے مجھ پہ عکسِ ذوقِ نظر
بساطِ آئینۂ حُسنِ خود نما معلوم

معاملہ نگہِ ناز سے ہے اے اصغرؔ
بہانۂ الم و حیلۂ قضا معلوم

ہر موجِ ہوا زلفِ پریشانِ محمدؐ
ہے نُورِ سحر صورتِ خندانِ محمدؐ

کچھ صبحِ ازل کی نہ خبر شامِ ابد کی
بیخود ہُوں تہِ سایۂ دامانِ محمدؐ

تُو سینۂ صدیقؓ میں اِک رازِ نہاں ہے
اللہ رے اے صورتِ جانانِ محمدؐ

چھُٹ جائے اگر دامنِ کونین تو کیا غم
لیکن نہ چھُٹے ہاتھ سے دامانِ محمدؐ

دے عرصۂ کونین میں یارب کہیں وسعت
پھر وجد میں ہے رُوحِ امیدانِ محمدؐ

بجلی ہو، مہ و مہر ہو، یا شمعِ حرم ہو
ہے سب کے جگر میں رُخِ تابانِ محمدؐ

اے حُسنِ ازل اپنی اداؤں کے مزے لے
ہے سامنے آئینۂ حیرانِ محمدؐ

اصغرؔ ترے نغموں میں بھی ہے جوشِ رُود آب
اے بُلبُلِ شوریدۂ بُستانِ محمدؐ

ازل میں کچھ جھلک پائی تھی اس آشوبِ عالم کی
ابھی تک ذرّہ ذرّہ پر ہے حالت رقصِ پیہم کی

نظامِ دہر کیا؟ بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں
گدازِ عشق گویا رُوح ہے اجزائے عالم کی

نہیں معلوم کتنے جلوہ ہائے حُسن پنہاں ہوں
کوئی پہنچا نہیں گہرائیوں میں اشکِ پیہم کی

خودی ہے جو لئے جاتی ہے سب کو بیخبر کر کے
اسی چھوٹے سے نقطہ پر نظر ہے سارے عالم کی

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ محبت ہے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

نہ سمجھا دہر کو میں مبتلائے رنگ و بُو ہو کر
مجھے سازِ طرب نے دیں صدائیں نالہ و غم کی

غزل کیا اِک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغرؔ
یہاں افسوسِ گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

ہم ایک بار جلوۂ جانانہ دیکھتے
پھر کعبہ دیکھتے نہ صنم خانہ دیکھتے

گر نا وہ جھُوم جھُوم کے رندانِ مست کا
پھر پائے خُم پہ سجدۂ شکرانہ دیکھتے

اک شعلہ اور شمع سے بڑھ کر ہے رقص میں
تم چیر کر تو سینۂ پروانہ دیکھتے

رندوں کو صرف نشۂ بیرنگ سے غرض
یہ شیشہ دیکھتے ہیں نہ پیمانہ دیکھتے

بکھری ہوئی ہو زلف بھی اُس چشمِ مست پر
ہلکا سا ابر بھی سرِ میخانہ دیکھتے

ملتی کہیں کہیں پہ رہِ مستقیم بھی
اہلِ طریق لغزشِ مستانہ دیکھتے

شاید کہ پیام آیا پھر وادیٔ سینا سے
شعلے سے لپکتے ہیں کچھ کسوتِ مینا سے

مجھ کو وہی کافی ہے ساقی ترے مینا سے
جو کھنچ کے چلی آئی خود جذبِ تمنّا سے

عالم کی فضا پوچھو محرومِ تمنّا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں اُٹھ جائے جو دُنیا سے

یارب مجھے مطلب ہے شیشہ سے نہ مینا سے
ساغر کوئی ٹپکا دے اس اوجِ ثُریّا سے

اسرارِ حقیقت کو اِک ایک سے پُوچھا ہے
ہر نغمۂ رنگیں سے، ہر شاہدِ زیبا سے

میخانہ کی یہ صحبت اے شیخ غنیمت ہے
لے کچھ لبِ ساغر سے کچھ سینۂ مینا سے

رہ رہ کے چمکتی ہے وہ برقِ تبسّم بھی
لہریں سی جو اُٹھتی ہیں کچھ چشمِ تمنّا سے

تم دید کو کہتے ہو، آئینہ ذرا دیکھو!
خود حُسن نکھر آیا اِس کیفِ تماشا سے

انوار کی ریزش ہو، اسرار کی بارش ہو
ساغر کو جو ٹکرا دوں اِس گنبدِ مینا سے

یا زندگیٔ نَو تھی ہر موجِ حوادث کی
یا موت کا طالب ہُوں انفاسِ مسیحا سے

وہ عشق کی عظمت سے واقف ہی نہیں شاید
سو حُسن کروں پیدا اک ایک تمنّا سے

اشعار پہ اصغرؔ کے ہے رقصِ رگِ جاں میں
اِک موجِ نسیم آئی کیا باغِ مصلّےٰ سے

برق میں جوش و اضطراب ذرّے میں سوز و سازِ عشق
کُل یہ فضائے دہر ہے سینۂ پُر گدازِ عشق

قتنۂ دہر مٹ گیا، حشر اُٹھا تھا اُٹھ چُکا
ختم مگر نہ ہو سکا مرحلۂ درازِ عشق

محوِ ادا و ناز ہے، یوں ہمہ تن نیاز ہے
پُوچھ صنم پرست سے کیفیتِ نمازِ عشق

مستیٔ نازِ حُسن کو سُنتے ہیں، بے نیاز ہے
اِس سے بھی بے نیاز تر بیخودیٔ نیازِ عشق

حسرت و آرزو سے ہیں اہلِ ہوس بھی آشنا
اِک غمِ ناتمام ہے طرۂ امتیازِ عشق

زاہدِ سادہ لوح کو وہم تھا، اِشتباہ تھا
مصحفِ رُخ سے حل ہُوا مسئلۂ جوازِ عشق

بیخود و محوِ جسم و جاں مستِ زمین و آسماں
حُسن نے دستِ ناز سے چھیڑ دیا ہے رازِ عشق

گُلوں کی جلوہ گری، مہر و مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسمِ بے سببی

گذر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں، نہ ثُریّا، نہ خوشۂ عنبی

یہ زندگی ہے، یہی اصلِ علم و حکمت ہے
جمالِ دوست و شبِ مہ و بادۂ عنبی

فروغِ حُسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادا و رسمِ بلالی و طرزِ بو لہبی

ہجومِ غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا
کہاں ہے آج تو اے آفتابِ نیم شبی!

سرشتِ عشق طلب اور حُسن بے پایاں
حصولِ تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی

وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اُڑائی ہیں
جہاں سے تُو نے لئے خندہ ہائے زیر لبی

کشش نہ جامِ نگاریں کی پُوچھ اے ساقی
جھلک رہا ہے مرا آب و رنگِ تشنہ لبی

صحنِ حرم نہیں ہے، یہ کوئے بتاں نہیں
اب کچھ نہ پوچھیے کہ کہاں ہوں، کہاں نہیں

مجھ میں نوائے عیش کی رنگینیاں نہیں
سوزِ خموشِ عشق ہوں، سازِ بیاں نہیں

مدت ہوئی کہ چشمِ تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

وہ بہترین دورِ محبت گذر گیا!
اب مبتلائے کشمکشِ امتحاں نہیں

اب ہو تو سنگ وخشت سے سر کو سکون ہو
وہ آستاں نہیں تو کوئی آستاں نہیں

کیا مشقِ آرزو کی ہیں یہ سحر کاریاں!
کیا گوشۂ قفس میں مرا آشیاں نہیں

کسبِ حیاتِ نو تری ہر ہر ادا سے ہے
مرنا پسندِ خاطرِ اربابِ جاں نہیں

سارا حصول عشق کی ناکامیوں میں ہے
جو عمر رائیگاں ہے، وہی رائیگاں نہیں

تسلیم مجھ کو خانۂ کعبہ کی منزلت
سب کچھ سہی، مگر وہ ترا آستاں نہیں

ہوتا ہے رازِ عشق و محبت انہیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں، مگر بے زباں نہیں

فطرت سنا رہی ہے ازل سے اسی طرح
لیکن ہنوز ختم مری داستاں نہیں

دیکھوں ہجومِ غم میں وہ لے کس طرح خبر
یہ اس کا امتحاں ہے، مرا امتحاں نہیں

اب اس نگاہِ ناز سے ربطِ لطیف ہے
مجھ کو دماغِ صحبتِ روحانیاں نہیں

کیا فیض بخشیاں ہیں رخِ بے نقاب کی
ذروں میں روح دوڑ گئی آفتاب کی

طاقت کہاں مشاہدۂ بے حجاب کی
مجھ کو تو پھونک دے گی تجلی نقاب کی

مجھ کو خبر رہی نہ رخِ بے نقاب کی
ہیں خود نمودِ حسن میں شانیں حجاب کی

اتنا کہ اذنِ شورش و فریاد دیجیے
مجھ کو سوال کی نہ ضرورت جواب کی

میں بوالہوس نہیں کہ بجھاؤں گا تشنگی
میرے لئے تو اُٹھتی ہیں موجیں سراب کی

نقشِ قدم یہ ہیں اسی جانِ بہار کے
اک پنکھڑی پڑی ہے لحد پر گلاب کی

موسیٰ ظہورِ برقِ تجلّی سے غش ہوئے
مجھ کو تو مار ڈالتی، شوخی جواب کی

حل کر لیا مجاز و حقیقت کے راز کو
پائی ہے میں نے خواب میں تعبیر خواب کی

نفی ہر عمل میں دعوئ ہستی کی معصیت
مستوں نے اور راہ نکالی ثواب کی

کچھ اُن کی شوخیوں سے مجھے وہم ہو چلا
دیکھوں تو قلب چیر کے شکل اضطراب کی

پیری میں عقل آئی تو سمجھے کہ خوب تھی
ڈوبی ہوئی نشاط میں غفلت شباب کی

نہ ہوگا کاوشِ بے مدّعا کا رازداں برسوں
وہ زاہد جو رہا سرگشتۂ سود و زیاں برسوں

ابھی مجھ سے سبق لے محفلِ روحانیاں برسوں
رہا ہوں میں شریکِ حلقۂ پیرِ مغاں برسوں

کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا میں نے نغمۂ رنگیں
کہ فرطِ ذوق سے جھومی ہے شاخِ آشیاں برسوں

جبینِ شوق لائی ہے وہاں سے داغِ ناکامی
یہ کیا کرتی رہی کمبخت ننگِ آستاں برسوں

وہی تھا حال میرا جو بیاں میں آ نہ سکتا تھا
جسے کرتا رہا افشا سکوتِ رازداں برسوں

نہ پوچھو مجھ سے کیا گزری ہے میری مشقِ حسرت سے
قفس کے سامنے رکھا رہا ہے آشیاں برسوں

خروشِ آرزو ہو، نغمۂ خاموشِ الفت بن
یہ کیا اک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں

نہ کی کچھ لذتِ افتادگی میں اعتنا میں نے
مجھے دیکھا کیا اُٹھ کر غبارِ کارواں برسوں

وہاں کیا ہے؟ نگاہِ ناز کی ہلکی سی جنبش ہے
مزے لے لے کے اب تڑپا کریں اربابِ جاں برسوں

محبت ابتدا سے تھی مجھے گلہائے رنگیں سے
رہا ہوں آشیاں میں لے کے برقِ آشیاں برسوں

مَیں وہ ہرگز نہیں جس کو قفس سے موت آتی ہو　　مَیں وہ ہوں جس نے خود دیکھا نہ سوئے آشیاں برسوں

غزل میں دردِ رنگیں تُو نے اصغؔر بھر دیا ایسا
کہ اس میدان میں روتے رہیں گے نوحہ خواں برسوں

یہ عشق نے دیکھا ہے یہ عقل سے پنہاں ہے　　قطرہ میں سمندر ہے ذرّہ میں بیاباں ہے
ہے عشق کہ محشر میں یُوں مست و خراماں ہے　　دوزخ بگریباں ہے، فردوس بہ داماں ہے
ہے عشق کی شورش سے رعنائی و زیبائی　　جو خُون اُچھلتا ہے، وہ رنگِ گلستاں ہے
پھر گرمِ نوازش ہے ضَو مہرِ درخشاں کی　　پھر قطرۂ شبنم میں ہنگامۂ طوفاں ہے
اَے پیکرِ محبوبی مَیں کس سے تجھے دیکھوں　　جس نے تجھے دیکھا ہے وُہ دیدۂ حیراں ہے
سَو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　جب آنکھ کھُلی دیکھا، اپنا ہی گریباں ہے
اِک شورشِ بے حاصل، اِک آتشِ بے پروا　　آفتکدۂ دِل میں اب کُفر نہ ایماں ہے
دھوکا ہے یہ نظروں کا، بازیچہ ہے لذّت کا　　جو کنجِ قفس میں تھا، وہ اصلِ گلستاں ہے
اِک غنچۂ افسردہ، یہ دِل کی حقیقت تھی　　یہ موجِ زنی خوں کی، رنگینیٔ پیکاں ہے
یہ حُسن کی موجیں ہیں یا جوشِ تبسّم ہے　　اُس شوخ کے ہونٹوں پر اک برق سی لرزاں ہے

اصغؔر سے مِلے لیکن اصغؔر کو نہیں دیکھا
اشعار میں سُنتے ہیں کچھ کچھ وہ نمایاں ہے

ہر شَے میں تُو ہی تُو ہے، بہ بُعد یہ حرماں ہے　　صورت جو نہیں دیکھی یہ قُربِ رگِ جاں ہے
مضرابِ محبت سے اِک نغمۂ لاہوتی　　پھر جوشِ ترنّم سے بیتاب رگِ جاں ہے

آغوش میں ساحل کے کیا لطف سکوں اس کو
یہ جانِ ازل ہی سے پروردۂ طوفاں ہے

سب رنگِ لطافت ہے افتادگیٔ غم میں
میں خاک ہوں اور مجھ میں سب رازِ گلستاں ہے

گم صاحبِ تمکیں ہے افسانۂ محفل میں
مجنوں کو یہی لیکن پیغامِ بیاباں ہے

ہیچ حسنِ تعیّن سے، ظاہر ہو کہ باطن ہو
یہ قیدِ نظر کی ہے، وہ فکر کا زنداں ہے

اِک ایک نفس میں ہے صد مرگِ بلا مضمر
جینا ہے بہت مشکل، مرنا بہت آساں ہے

اِک جہد و کشاکش ہے، ہستی جسے کہتے ہیں
کفّار کا مٹ جانا خود مرگِ مسلماں ہے

ہستی بھی مری پردہ، یہ لفظ و بیاں پردہ
وہ پردہ نشیں پھر بھی ہر پردے میں عریاں ہے

وہ نغمۂ رنگیں سب، میں بھول گیا اصغرؔ
اب گریۂ خونیں میں روداد گلستاں ہے

جو نقش ہے ہستی کا، دھوکا نظر آتا ہے
پردے پہ مصوّر ہی تنہا نظر آتا ہے

نیرنگِ تماشا وہ جلوا نظر آتا ہے
آنکھوں سے اگر دیکھو، پردا نظر آتا ہے

لَو شمعِ حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے
فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

اَے پردہ نشیں، ضد ہے کیا چشمِ تمنّا کو
تُو دفترِ گل میں بھی رُسوا نظر آتا ہے

نظّارہ بھی اب گم ہے، بیخود ہے تماشائی
اب کون کہے اس کو جلوا نظر آتا ہے

جو کچھ تھی یہاں رونق، سب بادِ چمن سے تھی
اب کُنجِ قفس مجھ کو سُونا نظر آتا ہے

احساس میں پیدا ہے پھر رنگِ گلستانی
پھر داغ کوئی دِل میں تازہ نظر آتا ہے

تھی فردِ عمل اصغرؔ کیا دستِ مشیّت میں
اِک ایک ورق اس کا سادا نظر آتا ہے

جانِ نشاط، حُسن کی دنیا کہیں جسے
جنت ہے ایک، خونِ تمنا کہیں جسے

اِس جلوہ گاہِ حُسن میں چھایا ہے ہر طرف
ایسا حجاب، چشمِ تماشا کہیں جسے

یہ اصل زندگی ہے، یہ جانِ حیات ہے
حُسنِ مذاق، شورشِ سودا کہیں جسے

میرے وداعِ ہوش کو اتنا بھی ہے بہت
یہ آب و رنگ، حُسن کا پردا کہیں جسے

اکثر رہا ہے حُسنِ حقیقت بھی سامنے
اِک مستقل سرابِ تمنا کہیں جسے

اب تک تمام فکر و نظر پر محیط ہے
شکلِ صفات معنیٔ اشیا کہیں جسے

ہر موج کی وہ شان ہے جامِ شراب میں
برقِ فضائے وادیٔ سینا کہیں جسے

زندانیوں کو آ کے نہ چھیڑا کرے بہت
جانِ بہار، نکہتِ رسوا کہیں جسے

اس ہولِ دل سے گرمِ رہِ عرصۂ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے، دنیا کہیں جسے

سرمستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں
اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
وہ ربطِ خاص، رنجشِ بیجا کہیں جسے

میری نگاہِ شوق پہ اب تک ہے منعکس
حُسنِ خیال، شاہدِ زیبا کہیں جسے

میری فغانِ درد پہ اُس سروِ ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضا کہیں جسے

دل جلوہ گاہِ حُسن بنا فیضِ عشق سے
وہ داغ ہے کہ شاہدِ رعنا کہیں جسے

اصغرؔ نہ کھولنا کسی حکمت مآب پہ
رازِ حیات، ساغر و مینا کہیں جسے

عشق ہے اِک کیفِ پنہانی مگر رنجور ہے
حُسن بے پروا نہیں ہوتا مگر مستور ہے

خستگی نے کر دیا اُس کو رگِ جاں سے قریب
جستجو ظالم کیے جاتی تھی منزل دور ہے

لے اسی ظلمت کدہ میں اس سے محرومی کی دلو
اس سے آگے، اے دلِ مضطر، حجابِ نور ہے

لب پہ موجِ حسن جب چمکے، تبسم نام ہو
ربِّ ارنی کہکے چیخ اٹھوں، تو برقِ طور ہے

نور آنکھوں میں اسی کا، جلوہ خود نورِ محیط
دید کیا ہے، کچھ تلاطم ہیں، ہجومِ نور ہے

آنکھ ہے جب محوِ حیرت، تو نمایاں ہے وہی
فکر ہو جب کارفرما، تو وہی مستور ہے

دیکھتا ہوں میں کہ ہے بحرِ حقیقت جوش پر
جو حباب اٹھ اٹھ کے بٹتا ہے سرِ منصور ہے

بسترِ خاک پہ بیٹھا ہوں، نہ مستی ہے نہ ہوش
ذرّے سب ساکت و صامت ہیں، ستارے خاموش

نظر آتی ہے مظاہر میں مری شکل مجھے
فطرت آئینہ بدست اور میں حیران و خموش

ترجمانی کی مجھے آج اجازت دے دے
شجرِ طور ہے ساکت، لبِ منصور خموش

بحر آواز انا البحر اگر دے تو بجا
پردۂ قطرۂ ناچیز سے کیوں ہے یہ خروش

ہستی غیب سے گہوارۂ فطرت جنباں
خواب میں طفلکِ عالم ہے سراسر مدہوش

پرتوِ مہر ہی ذوقِ رم و بیداری دے
بسترِ گل پہ ہے اک قطرۂ شبنم مدہوش

فریبِ دامِ گہ رنگ و بو معاذ اللہ
یہ اہتمام ہے اور ایک مشتِ پر کے لئے

جو دل سے تیر کوئی پار بھی ہوا تو کیا
تڑپ رہا ہوں ابھی تک تری نظر کے لئے

حقیقت ایک ہے صد ہا لباسِ رنگیں میں
نظر بھی چاہیئے کچھ حسنِ رہ گذر کے لئے

بہائے درد و الم درد و غم کی لذت ہے
وہ ننگِ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

بتوں کے حُسن میں بھی شان ہے خُدائی کی
ہزار عُذر ہیں اِک لذّتِ نظر کے لئے

سر سے پا تک میری ہستی گرمِ سوز و ساز ہے
جلوۂ حُسنِ بُتاں اِک غیب کی آواز ہے

چھیڑتی ہے کس لگاوٹ سے نگاہِ شوق کو
خود بہت باکیف تیری جلوہ گاہِ ناز ہے

دوست، اَے بینائیِ دِل ہے رگِ جاں سے قریب
درد جو کچھ ہے خود اپنا جلوۂ پرواز ہے

عشق مُتبسّم کہ یہ رازِ جہاں کی کائنات!
عقل سرگرداں کہ ہر ذرّہ جہانِ راز ہے

کس قدر پُرکیف ہے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
اصلِ نغمہ ایک آوازِ شکستِ ساز ہے

ہے بہت اعلیٰ مقامِ خستگی و عاجزی!
بے پر و بالی سروشِ عشق کی پرواز ہے

حُسن کے فتنے اُٹھے میرے مذاقِ شوق سے!
جس سے مَیں بے چین ہُوں وہ خُود مری آواز ہے

متفرقات

دیر و حرم بھی منزلِ جاناں میں آئے تھے
پر شکر ہے کہ بڑھ گئے دامن بچا کے ہم

عشق تھا آپ مشتعلِ حسن تھا خود نمود پر
میری نظر سے کیا ہوا تیری نظر نے کیا کیا

کہیں اور اب جو ہوتی ترے حسن کی تجلی
تو نہ میری خاک ملتی، نہ مرا غبار ہوتا

مطربِ فتنہ نوا، نغمۂ پر درد نہ چھیڑ
نکلا پڑتا ہے مرے سینہ سے باہر کوئی

رہا جو ہوش تو رندی و میکشی کیا ہے
ذرا خبر جو ہوئی، پھر وہ آگہی کیا ہے
کسی طرح تو دلِ زار کو قرار آئے
جو غم دیا ہے تو پھر سعیٔ دلدہی کیا ہے

سرودِ زندگی

اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

ترکِ مدّعا کر دے، عینِ مدّعا ہو جا
شانِ عید پیدا کر، مظہرِ خُدا ہو جا
اُس کی راہ میں مِٹ کر بے نیازِ خلقت بن
حُسن پر فِدا ہو کر حُسن کی ادا ہو جا
برگِ گُل کے دامن پر رنگ بن کے جمنا کیا
اِس فضائے گُلشن میں موجۂ صبا ہو جا
تو ہے جب پیام اُس کا پھر پیام کیا تیرا
تو ہے جب صدا اُس کی، آپ بے صدا ہو جا
آدمی نہیں سُنتا آدمی کی باتوں کو
پیکرِ عمل بن کر غیب کی صدا ہو جا
سازِ دل کے پردوں کو خود وہ چھیڑتا ہو جب
جانِ مضطرب بن کر تُو بھی لب کُشا ہو جا
قطرۂ تنک مایہ! بحرِ بے کراں ہے تو
اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا

شہود غیب ہُوا غیب ہو گیا ہے شہود

اگرچہ ساغرِ گل ہے تمامتر بے بود
چھلک رہی ہے چمن میں مگر شرابِ وجُود

جو لے اُڑا مجھے مستانہ وار ذوقِ سجُود
بُتوں کی صف سے اُٹھا نعرۂ انا المعبُود

کہاں خرد ہے، کہاں ہے نظامِ کار اس کا
یہ پُوچھتی ہے تری نرگسِ خُمار آلُود

یہی نگاہ جو چاہے وہ انقلاب کرے
لباسِ زُہد کو جس نے کیا شراب آلُود

شعاعِ مہر کی جولانیاں ہیں ذرّوں میں
حجابِ حُسن ہے آئینہ دارِ حسنِ وجُود

اُٹھا کے عرش کو رکھا ہے فرش پر لا کر
شہود غیب ہُوا، غیب ہو گیا ہے شہُود

مذاقِ سیر و نظر کو کچھ اور وسعت دے
کہ ذرّے ذرّے میں ہے اِک جہانِ نامشہُود

نیازِ سجدہ کو شائستہ و مکمّل کر
جہاں سے یُوں تو بنائے ہزار ہا معبُود

کیا ہوں مَیں؟

تمام دفترِ حکمت اُلٹ گیا ہوں مَیں
مگر کھُلا نہ ابھی تک کہاں ہُوں، کیا ہُوں مَیں

کبھی سُنا کہ حقیقت ہے میری لاہوتی
کہیں یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہُوں مَیں

یہ مجھ سے پُوچھئے، کیا جستجو میں لذّت ہے
فضائے دہر میں تحلیل ہو گیا ہُوں مَیں

ہٹا کے شیشہ و ساغر، ہجومِ مستی میں
تمام عرصۂ عالم پہ چھا گیا ہوں میں

اُڑا ہوں جب تو فلک پر لیا ہے دم جا کر
زمیں کو توڑ گیا ہوں جو رہ گیا ہوں میں

رہی ہے خاک کے ذرّوں میں بھی چمک میری
کبھی کبھی تو ستاروں میں مِل گیا ہوں میں

کبھی خیال کہ ہے خوابِ عالمِ ہستی
ضمیر میں ابھی فطرت کے سو رہا ہوں میں

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا
خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

کچھ انتہا نہیں نیرنگِ زیست کی میرے
حیاتِ محض ہوں، پروردۂ فنا ہوں میں

حیات و موت بھی ادنیٰ سی اک کڑی میری
ازل سے لے کے ابد تک وہ سلسلہ ہوں میں

کہاں ہے سامنے آ مشعلِ یقیں لے کر
فریب خوردۂ عقلِ گریز پا ہوں میں

نوائے راز کا سینے میں خون ہوتا ہے
ستم ہے، لفظ پرستوں میں گھر گیا ہوں میں

سما گئے مری نظروں میں، چھا گئے دل پر
خیال کرتا ہوں اُن کو کہ دیکھتا ہوں میں

نہ کوئی نام ہے میرا، نہ کوئی صورت ہے
کچھ اس طرح ہمہ تن دید ہو گیا ہوں میں

نہ کامیاب ہوا میں، نہ رہ گیا محروم
بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں میں

جہان ہے کہ نہیں، جسم و جاں بھی ہیں کہ نہیں
وہ دیکھتا ہے مجھے، اُس کو دیکھتا ہوں میں

میرا جہاں ہے، تیرا خیال ہے، تُو ہے!
مجھے یہ فرصتِ کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں؟

خطاب بہ مسلم

کہاں اے مسلمِ سرگشتہ تو محوِ تماشہ ہے
جب اس آئینۂ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے
ہجومِ کفر بھی جنبش ہے تیری زلفِ برہم کی
فضائے حسنِ ایماں انعکاسِ روئے زیبا ہے
جہانِ آب و گل میں ہے شرارِ زندگی تجھ سے
تری ذاتِ گرامی ارتقاء کا اک ہیولا ہے
تجھی سے اس جہاں میں ہے بنا آئینِ حکمت کی
کہ سب مے کی بدولت اصطلاحِ جام و مینا ہے
ضوابطِ دینِ کامل کے دیئے ہیں تیرے ہاتھوں میں
تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے
تجھی کو دیکھتا ہوں روحِ اقوام و مذاہب کی
یہ رازِ زندگی سن لے کہ ہر قطرے میں دریا ہے
فرشتوں نے وہاں پر حرزِ جاں اس کو بنایا ہے
فرازِ عرش پر تیرا ہی کچھ نقشِ کفِ پا ہے
جو ہو للّٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا
اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر ز دنیا ہے

فرائض کار رہے احساس عالم کے مذاہب میں
یہی عارف کا مقصد ہے یہی شارع کا ایماں ہے

آج بھی کچھ کمی نہیں چشمکِ برقِ طُور میں

مجھ پہ نگاہ ڈال دی اُس نے ذرا سرُور میں
صاف ڈبو دیا مجھے موجِ مئے طہُور میں
حُسنِ کرشمہ ساز کا بزم میں فیضِ عام ہے
جانِ بلاکشاں ابھی غرق ہے موجِ نُور میں
اُس نے مجھے دکھا دیا ساغرِ مے اُچھال کہ
آج بھی کچھ کمی نہیں چشمکِ برقِ طُور میں
خیرگیٔ نظر کے ساتھ ہوش کا بھی پتہ نہیں
اَور بھی دُور ہو گئے آ کے تیرے حضُور میں
تیری ہزار برتری، تیری ہزار مصلحت
میری ہر اِک شکست میں، میرے ہر اِک قصُور میں

کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

نمایاں کر دیا میں نے بہارِ روئے خنداں کو
کہ دی نغمے کو مستی، رنگ کچھ صبحِ گلستاں کو
ذرا تکلیفِ جنبش دے نگاہِ برق ساماں کو
جہاں میں منتشر کر دے مذاقِ سوزِ پنہاں کو
ذرا رو کے ہونے موجِ تبسم ہائے پنہاں کو
ابھی یہ لے اڑیں گی بجلیاں تارِ رگِ جاں کو
قفس ہو، دام ہو، کوئی چھڑائے، اب یہ ناممکن
انل کے دن کلیجے میں بٹھایا تھا گلستاں کو
بس اتنے پر ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا
کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہرِ درخشاں کو
تمنا ہے نکل کر سامنے بھی عشوہ فرما ہو
کوئی دیتا ہے جنبش پردۂ بے تابیٔ جاں کو
یہاں کچھ نخل پر بکھرے ہوئے اوراقِ رنگیں ہیں
مگر اک مشتِ پر سے پوچھئے رازِ گلستاں کو
دکھائی صورتِ گل یہ بہارِ شوخیٔ پنہاں
چھپایا معنیٔ گل میں کبھی حسنِ نمایاں کو

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اس سے
نہ کفر اب تک ہُوا واقف، خبر اس کی نہ ایماں کو
سُنا ہے حشر میں شانِ کرم بے تاب نکلے گی
لگا رکھا ہے سینہ سے متاعِ ذوقِ عصیاں کو
نہ میں دیوانہ ہُوں اصغرؔ نہ مجھ کو ذوقِ عُریانی
کوئی کھینچے لیے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

دے مرکے ثبوت زندگی کا

یہ راز ہے میری زندگی کا
پہنے ہوئے ہُوں کفن خودی کا

پھر نشترِ غم سے چھیڑتے ہیں
اِک طرز ہے یہ بھی دِل دہی کا

پھر ڈھونڈ رہا ہُوں بے خودی میں
کھویا ہُوا لُطف آگہی کا

او، لفظ و بیاں میں چھپنے والے
اب قصد ہے اور خامشی کا

مرنا تو ہے ابتدا کی اِک بات
جینا ہے کمال منتہی کا

عالَم پہ ہے اِک سکونِ بے تاب
یا عکس ہے میری خامشی کا

ہاں سینہ گلیوں کی طرح کر چاک
دے مرکے ثبوت زندگی کا

یاسؔ اک جنُونِ ہوشیاری
اُمیدِ فریبِ زندگی کا

عالم رَواں دَواں بہ تقاضائے عشق ہے

ذرّوں کا رقص مستیٔ صہبائے عشق ہے
عالم رَواں دَواں بہ تقاضائے عشق ہے

بیٹھا ہے ایک خاک نشیں محوِ بے خودی
کچھ حُسن سے غرض ہے نہ پروائے عشق ہے

ہیجان و اضطراب ہے اُمیدِ وصل ہے
رازِ حیات شورشِ بیجائے عشق ہے

ہر عشوۂ حجاب، طریقِ نمودِ حُسن
ہر حرفِ شوق پردۂ اخفائے عشق ہے

اب خود یہاں تغافل و بیگانگی سی ہے
کچھ یہ بھی طرفہ کاریٔ سودائے عشق ہے

جب یہ نہیں تو ختم ہیں رنگینیاں تمام
سازِ خودی میں جوشِ نواہائے عشق ہے

کس درجہ ایک خاک کے ذرّے میں ہے تپش
ارض و سما میں شورش و غوغائے عشق ہے

ساغرِ بکف گرے تو سنبھلنا نہ چاہیئے

شکوہ نہ چاہیئے کہ تقاضا نہ چاہیئے
جب جان پر بنی ہو تو کیا کیا نہ چاہیئے

ساقی تری نگاہ کو پہچانتا ہوں میں
مجھ سے فریبِ ساغر و مینا نہ چاہیئے

یہ آستانِ یار ہے، صحنِ حرم نہیں
جب رکھ دیا ہے سر تو اُٹھانا نہ چاہیئے

خود آپ اپنی آگ میں جلنے کا لُطف ہے
اہلِ تپش کو آتشِ سینا نہ چاہیئے

کیا کم ہیں ذوقِ دید کی جلوہ فرازیاں؟
آنکھوں کو انتظارِ تماشا نہ چاہیئے
وہ بارگاہِ حُسن ادب کا مقام ہے
جُز دردو اشتیاق تقاضا نہ چاہیئے
تیغِ ادا میں اُس کے ہے اِک رُوحِ تازگی
ہم کُشتگانِ شوق کو مرجانا چاہیئے
ہستی کے آب و رنگ کی تعبیر کچھ تو ہو
مجھ کو فقط یہ خوابِ زلیخا نہ چاہیئے
اس کے سوا تو معنئ مجنوں بھی کچھ نہیں
ایسا بھی ربط صورتِ لیلیٰ نہ چاہیئے
ٹھہرے اگر تو منزلِ مقصُود پھر کہاں
ساغر بکف گرے تو سنبھلنا نہ چاہیئے
اِک جلوہ خال و خط سے بھی آراستہ سہی
داماندگئ ذوقِ تماشہ نہ چاہیئے
سب اہلِ دید بیخود و حیران و مست ہیں
کوئی اگر نہیں ہے تو پروا نہ چاہیئے

اصغرؔ صنم پرست سہی پھر کسی کو کیا
اہلِ حرم کو کاوشِ بیجا نہ چاہیئے

اِک تازہ زندگی ہے ہر اِک انقلاب میں

موجوں کا عکس ہے خطِ جامِ شراب میں
یا خوں اُچھل رہا ہے رگِ ماہتاب میں
باقی نہ تابِ ضبط رہی شیخ و شاب میں
اُن کی جھلک بھی تھی مری چشمِ پُرآب میں
کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں
اِک تازہ زندگی ہے ہر اِک انقلاب میں
وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عینِ زندگی ہے جو ہے اضطراب میں
اتنا ہوا دلیل تو دریا کی بن سکے
مانا کہ اور کچھ نہیں موج و حباب میں

اُس دن بھی میری رُوح تھی محوِ نشاطِ دید
مُوسیٰ اُلجھ گئے تھے سوال و جواب میں

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حُسن ہے
جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں

میں اضطرابِ شوق کہوں یا جمالِ دوست
اِک برق ہے جو کوندرہی ہے نقاب میں

بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

میخانۂ ازل میں جہانِ خراب میں
ٹھہرا گیا نہ ایک جگہ اضطراب میں

اس رُخ پہ ہے نظر کبھی جامِ شراب میں
آیا کہاں سے نورِ شبِ ماہتاب میں

اقلیمِ جاں میں ایک تلاطم مچا دیا
یوں دیکھئے تو کچھ نہیں تارِ رُباب میں

اے کاش میں حقیقتِ ہستی نہ جانتا
اب لُطفِ خواب بھی نہیں احساسِ خواب میں

وہ برقِ رنگ خرمنِ جاں کے لئے کہاں
مانا کہ بُو ہے گل کی تو ملے گی گلاب میں

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیئے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے
ہے زندگی کا راز تلاشِ سراب میں

بس اس ادائے مست خرامی کو کیا کہوں
میری نظر تو غرق ہے موجِ شراب میں

اصغرؔ غزل میں چاہیئے وہ موجِ زندگی
جو حُسن ہے بتوں میں، جو مستی شراب میں

تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا، اُسے غمِ جاناں بنا دیا

میں کامیابِ دید بھی، محرومِ دید بھی
جلووں کے اژدہام نے حیران بنا دیا

یوں مسکرائے، جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں
کچھ جم کے رہ گیا، اُسے حرماں بنا دیا

اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قیدِ رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی
جب خاک کر دیا، اسے عرفاں بنا دیا

کیا کیا قیود دہر میں ہیں اہلِ ہوش کے
ایسی فضائے صاف کو زنداں بنا دیا

اِک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اس کو حُسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوریِ حیات میں رازِ حیات ہے
زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

وہ شورشیں، نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا، انہیں انساں بنا دیا

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے بیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا

بُلبُل بہ آہ و نالہ و گل مستِ رنگ و بُو
مجھ کو شہیدِ رسمِ گلستاں بنا دیا

کہتے ہیں اِک فریبِ مسلسل ہے زندگی
اس کو بھی وقفِ حسرت و حرماں بنا دیا

عالم سے بے خبر بھی ہوں، عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اِس حُسنِ کاروبار کو مستوں سے پوچھئے
جس کو فریبِ ہوش نے عصیاں بنا دیا

برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

خونِ آرزو افشا ہو کسی بہانے سے
رنگ کچھ ٹپکتا ہے حسن کے فسانے سے

رنج تھا اسیروں کو بال و پر کے جانے سے
اُڑ چلے قفس بیکر بوئے گل کے آنے سے

اب جو کچھ گزرنا ہو جان پر گزر جائے
جھاڑ کے اُٹھے دامن اُسکے آستانے سے

اشک اب نہیں تھمتے، دل پہ اب نہیں قابو
خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے

مُسکرائے جاتا ہوں، اشک بہتے جاتے ہیں
غم کا کام لیتا ہوں عیش کے ترانے سے

زخم آپ لیتا ہوں، لذتیں اُٹھاتا ہوں
تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہانے سے

روشنی ہو جگنو کی جیسے شبستاں میں
وہ نقاب کا عالم اس کے مُسکرانے سے

کثرتِ مظاہر ہے دفترِ فنا آموز
نیند آئی جاتی ہے حسن کے فسانے سے

اک نگارِ محبوبی اشکِ خوں میں پنہاں ہے
حسن کی نمائش ہے عشق کے بہانے سے

بے خودی کا عالم ہے محوِ جبہہ سائی میں
اب نہ سر سے مطلب ہے اور نہ آستانے سے

ایک ایک تنکے پر سو شکستگی طاری
برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

زمزمہ طرازوں کی گرمیِ نوا معلوم
موجِ برق اُٹھتی ہے میرے آشیانے سے

اس فضائے تیرہ کو گرم کر، منوّر کر
داغِ دل نہیں کھلتا دیکھنے دکھانے سے

اِک مقام ہے جہاں شام نہیں سحر نہیں

جُز دلِ حیرت آشنا اور کو یہ خبر نہیں — اِک مقام ہے جہاں شام نہیں، سحر نہیں
محوِ ذوقِ دید بھی جلوۂ حُسنِ یار بھی — ایک شعاعِ نُور ہے، اب یہ نظر نظر نہیں
سرو بھی، جوئے بار بھی، لالہ و گُل، بہار بھی — جس سے چمن چمن بنا ایک وہ مشتِ پر نہیں
اب نہ وہ قیل و قال ہے، اب نہ وہ ذوقِ حال ہے — میرا مقام ہے وہاں میرا جہاں گذر نہیں
اس کی نگاہِ مہر خود مجھ کو اڑا کے لے چلی! — شبنمِ خستہ حال کو حاجتِ بال و پر نہیں

فتنۂ دہر بھی بجا، فتنۂ حشر بھی دُرست
لذّتِ غم کے واسطے جب کوئی فتنہ گر نہیں

جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرزِ نظر ہے

جینے کا نہ کچھ ہوش نہ مرنے کی خبر ہے
اے شعبدہ پرداز یہ کیا طرزِ نظر ہے
سینے میں یہاں دل ہے نہ پہلو میں جگر ہے
اب کون ہے جو تشنۂ پیکانِ نظر ہے
ہے تابشِ انوار سے عالم تہ و بالا

جلوہ وہ ابھی تک تہہِ دامانِ نظر ہے
کچھ ملتے ہیں اب پختگیٔ عشق کے آثار

نالوں میں رسائی ہے نہ آہوں میں اثر ہے
ذرّوں کو یہاں چین نہ اجرامِ فلک کو

یہ قافلہ بے تاب کہاں گرمِ سفر ہے
خاموش! یہ حیرت کدۂ دہر ہے اصغرؔ

جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرزِ نظر ہے

حسن پرحسنِ تبسم، صبحِ خندانِ بہار

ہے سراپا حُسن وہ رنگیں ادا، جانِ بہار
حُسن پرحُسنِ تبسم، صبحِ خندانِ بہار

ایک سی گلکاریاں ہیں، ایک سی رنگیں بہار
لے کے دامانِ نظر سے تا بہ دامانِ بہار

ذرّہ ذرّہ بھرنے گا اک جہانِ رنگ و بُو
چپکے چپکے ہو رہا ہے عہد و پیمانِ بہار

سبزہ و گُل لہلہاتے ہیں، نمو کا زور ہے
موجِ زنگارنگ ہے یا جوشِ طوفانِ بہار

یُوں نہ اس دورِ خزاں کو بے حقیقت جانیے
پرورش پائی ہے اس نے زیرِ دامانِ بہار

پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں

نالۂ دلخراش میں آہِ جگر گداز میں
کون ستم طراز ہے پردۂ سوز و ساز میں

چاہیئے داغِ معصیت اس کے حریمِ ناز میں
پھول یہ ایک بھی نہیں دامنِ پاکباز میں

یاد خود کو، ہوش کو مستی و بے خودی سکھا
یا نہ کسی کو ساتھ لے اُس کے حریمِ ناز میں

حشر میں اہلِ حشر سے دیکھیئے خوش ادائیاں
فردِ عمل تو چاہیئے دستِ کرشمہ ساز میں

اب وہ عدم عدم نہیں، پرتوِ حسنِ یار سے
باغ و بہار بن گیا آئینہ دستِ ناز میں

گم ہے حقیقت آشنا بندۂ دہر بے خبر
ہوش کسی کو بھی نہیں مے کدۂ مجاز میں

موجِ نسیمِ صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے
اور بھی جان پڑ گئی کیفیتِ نماز میں

کچھ تو کمالِ عشق نے حسن کا رنگ اُڑا لیا
ایک ادائے ناز ہے بیخودیٔ نیاز میں

شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

اصغرِ خاکسار وہ ذرّۂ خود شناس ہے
حشر سا کر دیا بپا جس نے جہانِ راز میں

تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں

اب نہ کہیں نگاہ ہے، اب نہ کوئی نگاہ ہے
محو کھڑا ہوا ہوں میں حُسن کی جلوہ گاہ میں
اب تو بہارِ رنگ رنگ، وائے ورائے آب و رنگ
عشق کسی نگاہ میں، حُسن کسی نگاہ میں
حُسنِ ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے
ملحدِ باخبر بھی گم جلوۂ لا الٰہ میں
در یہ جو تیرے آ گیا، اب نہ کہیں مجھے اُٹھا
گردشِ مہر و ماہ بھی دیکھ چکا ہوں راہ میں
اب وہ زماں نہ وہ مکاں، اب وہ زمیں نہ آسماں
تم نے جہاں بدل دیا آ کے مری نگاہ میں
رازِ فتادگی نہ پوچھ، لذتِ خستگی نہ پوچھ
ورنہ ہزار جبرئیلؑ چھپ گئے گردِ راہ میں
لفظ نہیں، بیاں نہیں، یہ کوئی داستاں نہیں
شرحِ نیاز و عاشقی ختم ہے ایک آہ میں

میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے

پردۂ فطرت میں میرے اِک نوائے راز ہے
ذرّہ ذرّہ اِس جہاں کا گوش برآواز ہے

وہ سراپا حُسن ہے یا نغمۂ بے ساز ہے
چشمِ حیرت ہے کہ اک فریادِ بے آواز ہے

تو بہت سمجھا تو کہہ گذرا فریبِ رنگ و بُو
یہ چمن لیکن اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

گوشہ گوشہ علم و حکمت کا ہے سب دیکھا ہُوا
یہ غنیمت ہے درِ میخانہ اب تک باز ہے

کیف و مستی کی حقیقت ایک مینائے تہی
نغمہ بھی اس بزم میں ٹوٹا ہُوا اِک ساز ہے

کیا گزرتی ہے شبِ غم، تم اسی سے پُوچھ لو
ایک پیاری شکل میری محرم و ہمراز ہے

بندشوں سے اور بھی ذوقِ رہائی بڑھ گیا
اب قفس بھی ہم اسیروں کو پرِ پرواز ہے

ہے خرد، کی عشق کی دونوں کی ہستی پر نظر
یہ شہیدِ نغمہ ہے، وہ مبتلائے ساز ہے

ہوش باقی ہوں تو اس پر کاوشِ بیجا بھی ہو
کیا خبر مجھ کو کہ یہ آواز ہے یا ساز ہے
کیا تماشہ ہے کہ سب ہیں اور پھر کوئی نہیں
اس کی بزمِ ناز بھی خلوت سرائے راز ہے
سُننے والا گوشِ بلبل کے سوا کوئی نہیں
ریشہ ریشہ ان گلوں کا اِک صدائے راز ہے
عام ہے وہ جلوہ، لیکن اپنا اپنا طرزِ دید
میری آنکھیں بند ہیں اور چشمِ انجم باز ہے
ختم کر اصغر یہ آشفتہ نوائی ختم کر!!
کون سُنتا ہے اِسے، یہ درد کی آواز ہے

مجھ سے دیکھا نہ گیا حُسن کا رُسوا ہونا

مئے بے رنگ کا سو رنگ سے رُسوا ہونا
کبھی میکش، کبھی ساقی، کبھی مینا ہونا

از ازل تا بہ ابد محوِ تماشا ہونا
بس وہ ہوں جس کو نہ مرنا ہے، نہ پیدا ہونا

سارے عالم میں ہے بیتابی و شورش برپا
ہائے اُس شوخ کا ہم شکلِ تمنا ہونا

فصلِ گُل کیا ہے؟ یہ معراج ہے آب و گِل کی
میری رگ رگ کو مبارک رگِ سودا ہونا

کہہ کے کچھ لالہ و گل، رکھ لیا پردہ میں نے
مجھ سے دیکھا نہ گیا حُسن کا رُسوا ہونا

جلوۂ حسن کو ہے چشمِ تحیر کی طلب
کس کی قسمت میں ہے محرومِ تماشا ہونا

دہر ہی سے وہ نمایاں بھی ہے پنہاں بھی ہے
جیسے صہبا کے لئے پردۂ مینا ہونا

تیری شوخی، تیری نیرنگ ادائی کے نثار
اک نئی جان ہے ہر بار تمنا ہونا

حسن کے ساتھ ہے بیگانہ نگاہی کا مزہ
قہر ہے قہر مگر عرضِ تمنا ہونا

اس سے بڑھ کر کوئی بے راہ روی کیا ہوگی
گامِ پرشوق کا منزل سے شناسا ہونا

مائلِ شعر و غزل پھر ہے طبیعت، اصغرؔ
ابھی کچھ اور مقدر میں ہے رسوا ہونا!

رنگ کو شعلہ بنا کر کون پروانے میں ہے

ایک ایسی بھی تجلّی آج میخانے میں ہے
لطف پینے میں نہیں ہے، بلکہ کھو جانے میں ہے

معنیٔ آدم کجا و صورتِ آدم کجا؟
یہ نہاں خانے میں تھا۔ اب تک نہاں خانے میں ہے

خرمنِ بلبل تو پھونکا عشقِ آتش رنگ نے
رنگ کو شعلہ بنا کر کون پروانے میں ہے؟

جلوۂ حسنِ پرستش گرمیٔ حسنِ نیاز
ورنہ کچھ کعبے میں رکھا ہے، نہ بت خانے میں ہے

رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُڑا کر جُرعہ و گُل
اب نہ کچھ شیشے میں ہے باقی نہ پیمانے میں ہے
مَیں یہ کہتا ہُوں فنا کو بھی عطا کر زندگی!
تو کمالِ زندگی کہتا ہے، مر جانے میں ہے
جس پہ بُت خانہ تصدّق، جس پہ کعبہ بھی نثار
ایک صورت ایسی بھی، سُنتے ہیں، بُت خانے میں ہے
کیا بہارِ نقشِ پا ہے، اَے نیازِ عاشقی
لطف سر رکھنے میں کیا؟ سر رکھ کے مر جانے میں ہے
بے خُودی میں دیکھتا ہُوں بے نیازی کی اَدا
کیا فنائے عاشقی خود حُسن بن جانے میں ہے

ہمہ تن دید بنیں تجھ کو سراپا دیکھیں!

دیکھنے والے فروغِ رُخِ زیبا دیکھیں
پردۂ حُسن پہ خود حُسن کا پرتو دیکھیں
اشکِ پیہم کو سمجھ لیتے ہیں اربابِ نظر
حُسن تیرا مرے چہرے سے جھلکتا دیکھیں
ہے تقاضا ترے جلوے کی فراوانی کا

ہمہ تن دید بنیں، تجھ کو سراپا دیکھیں
ساقیا جام بکف پھر ہو ذرا گرم نوا
حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا دیکھیں
حسنِ ساقی کا تو مستوں کو ذرا ہوش نہیں
کچھ جھلک اس کی سرِ پردۂ مینا دیکھیں

رُخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

یہ ننگِ عاشقی ہے سود و حاصل دیکھنے والے
یہاں گمراہ کہلاتے ہیں منزل دیکھنے والے
خطِ ساغر میں رازِ حق و باطل دیکھنے والے
ابھی کچھ لوگ ہیں ساقی کی محفل دیکھنے والے
مزے آ آ گئے ہیں عشوہ ہائے حسنِ رنگیں کے
تڑپتے ہیں ابھی تک رقصِ بسمل دیکھنے والے
یہاں تو عمر گزری ہے اسی موج و تلاطم میں
وہ کوئی اور ہوں گے سیرِ ساحل دیکھنے والے
مرے نغموں سے صہبائے کہن بھی ہو گئی پانی
تعجب کر رہے ہیں رنگِ محفل دیکھنے والے

جنونِ عشق میں ہستیٔ عالم پہ نظر کیسی؟
رُخِ لیلیٰ کو کیا دیکھیں گے محمل دیکھنے والے

مقام اپنا سمجھتے ہیں نہ ہم منزل سمجھتے ہیں

متاعِ زیست کیا، ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
جسے سب درد کہتے ہیں، اُسے ہم دِل سمجھتے ہیں

اسی سے دل، اسی سے زندگیٔ دِل سمجھتے ہیں
مگر حاصِل سے بڑھ کر سعیٔ بے حاصِل سمجھتے ہیں

کبھی سُنتے تھے ہم، یہ زندگی ہے وہم و بے معنیٰ
مگر اب موت کو بھی خطرۂ باطِل سمجھتے ہیں

بہت سمجھے ہوئے ہے شیخ راہ و رسمِ منزل کو
یہاں منزل کو بھی ہم جادۂ منزل سمجھتے ہیں

اُبھرنا ہو جہاں، جی چاہتا ہے ڈوب مرنے کو
جہاں اُٹھتی ہوں موجیں، ہم وہاں ساحل سمجھتے ہیں

کوئی سرگشتۂ راہِ طریقت اس کو کیا جانے
یہاں افتادگی کو حاصِل منزل سمجھتے ہیں

تماشا ہے نیاز و ناز کی باہم کشاکش کا!

میں اُن کا دل سمجھتا ہوں، وہ میرا دل سمجھتے ہیں
عبث ہے دعویٰ عشق و محبت خام کاروں کو
یہ غم دیتے ہیں، جس کو جوہرِ قابل سمجھتے ہیں
غمِ لاانتہا، سعیٔ مسلسل، شوقِ بے پایاں
مقام اپنا سمجھتے ہیں نہ ہم منزل سمجھتے ہیں

کعبہ و بُت خانہ ہیں دونوں خُدا کے سامنے

رازِ کہیے یہ کِسی اہلِ دفا کے سامنے
آشنا گُم ہو گیا اِک آشنا کے سامنے
وہ ازل سے تا ابد ہنگامۂ محشر بپا
ہیں اِدھر خاموش اِک آفت ادا کے سامنے
دیکھیے اُٹھتا ہے کب کوئی یہاں سے اہلِ درد
کعبہ و بُت خانہ ہیں دونوں خدا کے سامنے
کامیابِ شوق کی ناکامیوں کو دیکھیے
حرفِ مطلب محو ہے جوشِ دُعا کے سامنے
اب مجھے خود بھی نہیں ہوتا ہے کوئی امتیاز
مٹ گیا ہوں اس طرح اُس نقشِ پا کے سامنے

کائناتِ دہر کیا روحِ الامیں بے ہوش تھے
زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے

حشر ہے زاہد، یہاں ہر چیز کا ہے فیصلہ
لا کوئی حسنِ عمل میری خطا کے سامنے

رشکِ صد ایماں ہے اصغرؔ میرا طرزِ کافری
میں خدا کے سامنے ہوں، بت خدا کے سامنے

ابھی تک شاخِ گُل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

ستم کے بعد اب اُن کی پشیمانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نظر کی فتنہ سامانی نہیں جاتی

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں
کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

پتہ ملتا نہیں اب آتشِ وادیٔ ایمن کا
مگر مینائے مے کی نور افشانی نہیں جاتی

مگر اک مشتِ پر کی خاک سے کچھ ربط باقی ہے
ابھی تک شاخِ گُل کی شعلہ افشانی نہیں جاتی

چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گُل کو
مگر موجِ صبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

اُڑا دیتا ہوں اب بھی نارِ تارِ ہست و بودِ اصغرؔ
لباسِ زہد و تمکیں پر بھی عریانی نہیں جاتی

کچھ فتنے اُٹھے حُسن سے کچھ حُسنِ نظر سے

جلوہ تراب تک ہے نہاں چشمِ بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

یہ عارضِ پرُ نور پہ زُلفیں ہیں پریشاں
کمبخت نکل کر ہی شام و سحر سے

مے دافعِ آلام ہے، تریاق ہے لیکن
کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

وُہ شوخ بھی معذور ہے، مجبور دل ہیں بھی
کچھ فتنے اُٹھے حُسن سے، کچھ حُسنِ نظر سے

اِس عالمِ ہستی میں نہ مرنا ہے نہ جینا
تُو نے کبھی دیکھا نہیں مستوں کی نظر سے

جانبازوں کے سینہ میں ابھی اور بھی دل ہیں
پھر دیکھئے اک بار محبت کی نظر سے

نظارۂ پرُ شوق کا اِک نام ہے جینا
مرنا اسے کہئے کہ گزرتے ہیں اِدھر سے

رگِ ہر تاک سے آتی ہے کھنچکر میری قسمت کی

ذرا سی آس بندھنا چاہیئے دردِ محبت کی
کہ خود بے چین ہے ذوقِ نوا سے بزمِ فطرت کی
نقابِ رُخ اُلٹ کر آج کیوں گرمِ تبسم ہو
شعاعیں مجھ پہ کیوں پڑتی ہیں خورشیدِ قیامت کی
جہاں کی خیر ہو، جانِ حزیں کی خیر ہو، یارب
کہ لَو اُونچی ہوئی جاتی ہے اب سوزِ محبت کی
مَیں رندِ بادہ کش بھی بے نیازِ جام و ساغر بھی
رگِ ہر تاک سے آتی ہے کھنچکر میری قسمت کی
وہی بے تابیاں جانے، وہی یہ خستگی سمجھے
کہ جس نے آب و گِل میں شورشیں بھر دیں محبت کی
جہانِ گوہرِ مقصود ابھی گہرائیوں میں ہے
نظر پہنچے گی کیا افتادہ گردابِ حیرت کی
ترے نغمے کی لَے، اے مطربِ آفت نوا کیا ہے
یہ موجِ برق ہے یا اک چمک دردِ محبت کی
اُٹھا رکھا ہے اُس نے جلوے کو قیامت پر
قیامت ہے وہ جلوہ اُس کو کیا حاجت قیامت کی

تکلم ہے ترا یا شعلۂ وادیٔ ایمن ہے!
تبسم زیرِ لب ہے یا کلی کھلتی ہے جنت کی
یہ بن کر برق و باراں، دیکھیے کیا کیا غضب ڈھائے
خمِ گردوں سے موجِ مے اٹھی ہے کس قیامت کی
طبیعت خود بخود آمادۂ وحشت تھی اے اصغر
ہوائے فصلِ گل نے اور بھی اس پر قیامت کی

جہاں میں چشمِ مہ و مہر باز رہنے دے

الٰہی خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے
مجاز کا بھی حقیقت سے ساز رہنے دے
دلِ حزیں میں شرارے دبے ہوئے ہیں ابھی
خدا کے واسطے، اے تے نواز رہنے دے
صنم کدے میں تجلّی کی تاب مشکل ہے
حرم میں شیخ کو محوِ نماز رہنے دے
خبر کسی کو نہ ہوگی، کنارِ شوق میں آ
جہاں میں چشمِ مہ و مہر باز رہنے دے
حیاتِ تازہ کی رنگینیاں نہ مٹ جائیں
ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے
فسردہ دل ہوں، کہاں ہے وہ آتشیں نغمہ
کہ پردہ رہنے دے کوئی نہ ساز رہنے دے

حریمِ ناز کے آداب اور ہیں اصغر
نیاز رکھ کے بھی عرسِ نیاز رہنے دے

یہ نظّارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

کوئی محمل نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبارِ قیس خود اُٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنجِ اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح، آزاد ہوتا ہے

یہ سب نا آشنائے لذّتِ پرواز ہیں، شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیّاد ہوتا ہے

بہارِ سبزہ و گل ہے کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتی ہے دُنیا، میکدہ آباد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے اِک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں اس چمن کا یا خزاں سمجھوں
زبانِ برگِ گل سے مجھ کو کیا ارشاد ہوتا ہے؟

ازل میں اک تجلّی سے ہوئی تھی بیخودی طاری
تمہیں کو میں نے دیکھا تھا کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارہ ہے یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

زمانہ ہے کہ خوگر ہو رہا ہے شورِ شیون کا
یہاں وہ درد جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں، وہیں صیّاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزامِ ہستی ہی نہیں اصغرؔ
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

کھلا ہے مجھ پر یہ رازِ ہستی کہ مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

مجاز کیسا؟ کہاں حقیقت؟ ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے
یہ سب ہے اِک خواب، کی سی حالت، جو دیکھتا ہے سحر نہیں ہے

شمیمِ گلشن، نسیمِ صحرا، شعاعِ خورشید، موجِ دریا
ہر ایک گرمِ سفر ہے ان میں مرا کوئی ہم سفر نہیں ہے

نظر میں وہ کُل سما گیا ہے تمام ہستی پہ چھا گیا ہے
چمن میں ہوں یا قفس میں ہوں میں مجھے اب اس کی خبر نہیں ہے

چمک دمک پر مٹا ہوا ہے، یہ باغباں تجھ کو کیا ہوا ہے
فریبِ شبنم میں مبتلا ہے، چمن کی اب تک خبر نہیں ہے

یہ مجھ سے سُن لے تو رازِ پنہاں، سلامتی خود ہے دشمنِ جاں
کہاں سے رہرو میں زندگی ہو کہ راہ جب پُرخطر نہیں ہے

میں سر سے پا تک ہوں مے پرستی، تمام شورش، تمام مستی
کھُلا ہے مجھ پر یہ رازِ ہستی کہ مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

ہوا کو موجِ شراب کر دے، فضا کو مست و خراب کر دے
یہ زندگی کو شباب کر دے، نظر تمہاری نظر نہیں ہے

پڑا ہے کیا اس کے در پہ اصغر، وہ شوخ مائل ہے امتحاں پر
ثبوت دے زندگی کا مر کر، نیاز اب کارگر نہیں ہے

کون ذرّہ ہے کہ سرشارِ محبت میں نہیں

عکس کس چیز کا آئینہ حیرت میں نہیں
تیری صورت میں ہے کیا، جو میری صورت میں نہیں

دونوں عالم تری نیرنگ ادائی کے نثار
اب کوئی چیز یہاں جیبِ محبت میں نہیں

دولتِ قُرب کو خاصانِ محبت جانیں
چند اشکوں کے سوا کچھ میری قسمت میں نہیں

لوگ مرتے بھی ہیں، جیتے بھی ہیں، بے تاب بھی ہیں
کون سا سحر تری چشمِ عنایت میں نہیں؟

سب سے اِک طرز جُدا، سب سے اک آہنگ جُدا
رنگ محفل میں ترا جو ہے وہ خلوت میں نہیں

نشۂ عشق میں ہر چیز اُڑی جاتی ہے
کون ذرّہ ہے کہ سرشارِ محبت میں نہیں

دعویٔ دید غلط، دعویٔ عرفاں بھی غلط
کچھ تجلّی کے سوا چشمِ بصیرت میں نہیں

ہو گئی جمع متاعِ غمِ حرماں کیونکر؟
بس سمجھتا تھا کوئی پردۂ غفلت میں نہیں

ذرّے ذرّے میں کیا جوششِ نرنم پیدا
خود مگر کوئی نوا سازِ محبت میں نہیں
نجد کی سمت سے یہ شورِ انا لیلےٰ کیوں
شوخیٔ حُسن اگر پردۂ وحشت میں نہیں

اِک لہو کی بُوند کیوں ہنگامہ آرا دل میں ہے

عشق کی فطرت ازل سے حُسن کی منزل میں ہے
قیس بھی محمل میں ہے، لیلیٰ اگر محمل میں ہے
جستجو ہے زندگی، ذوقِ طلب ہے زندگی
زندگی کا راز لیکن دُوریٔ منزل میں ہے
لالہ و گل تم نہیں ہو، ماہ و انجم تم نہیں
رنگِ محفل بن کے لیکن کون اس محفل میں ہے
اس چمن میں آگ برسے گی کہ آئے گی بہار
اِک لہو کی بُوند کیوں ہنگامہ آرا دل میں ہے
اُٹھ رہی ہے، مٹ رہی ہے موجِ دریائے وجود
اور کچھ ذوقِ طلب میں ہے نہ کچھ منزل میں ہے
طُور پر لہرا کے جس نے پھُونک ڈالا طُور کو

اِک شرارِ شوق بن کر میرے آب و گِل میں ہے
محو ہو کر رہ گئی جو، ہے وہی راہِ طریق
جو قدم مستانہ پڑتا ہے وہی منزل میں ہے
ہو کے رازِ عشق افشا بن گیا اِک راز دار
سب زباں پر آچکا ہے، سب ابھی تک دل میں ہے
عرش تک تولے گیا تھا ساتھ اپنے حُسن کو
پھر نہیں معلوم اب خود عشق کس منزل میں ہے
اصغرِ افسردہ ہے محرومِ موجِ زندگی!
تُو نوائے روح پرور بن کے کس محفل میں ہے

لُطف جب ہے اپنی دنیا آپ پیدا کیجئے

حُسن بن کر خود کو عالم آشکارا کیجئے
پھر مجھے پردہ بنا کر مجھ سے پردا کیجئے

اضطرابِ غم سے ہے نشو و نمائے زندگی
ہر نفس میں ایک تازہ درد پیدا کیجئے

کھل گیا رنگِ حسینانِ چمن
کم سے کم اتنا نظر میں حُسن پیدا کیجئے

عقل ہو غرقِ تجلّی، رُوح پا جائے جِلا
بیٹھ کر اک لحظہ شغلِ جام و مینا کیجئے

اک دلِ بیتاب ہیں پہلو میں پھر پیدا کروں
مُسکرا کر پھر ذرا مجھ سے تقاضا کیجئے

پرورش پاتا ہے رگ رگ میں مذاقِ عاشقی
جلوہ پھر دکھلایئے، پھر مجھ سے پردا کیجئے

اِس جہانِ غیر میں آرام کیا، راحت کہاں
لُطف جب ہے، اپنی دُنیا آپ پیدا کیجئے

دیر سے بھولے ہوئے ہیں درسِ مستی اہلِ بزم
آج ہر موجِ نفس کو موجِ صہبا کیجئے

رِند اِدھر بیخود، اُدھر دیر و حرم گرمِ طواف
عرش بھی اب جھوم کر آتا ہے، دیکھا کیجئے

دیکھتا ہوں میں کہ انساں کش ہے دریائے وجود
خود حباب و موج بن کر اب تماشا کیجئے

حُسن کی بیگانگی و بے نیازی سب بجا
اس پہ چھُپ کر پردۂ گل سے اشارا کیجئے

ایک ہی ساغر میں اصغؔر کھُل گئی دِل کی گرہ
رازِ ہستی بھی کھُلا جاتا ہے، دیکھا کیجئے

کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأتِ رِندانہ برسوں سے

خدا جانے کہاں ہے اصغؔر دیوانہ برسوں سے
کہ اس کو ڈھونڈھتے ہیں کعبہ و بُت خانہ برسوں سے

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے، نہ جل کر خاک ہونا ہے
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرتِ پروانہ برسوں سے

کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس دَرد کو سمجھے
نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

کبھی سوزِ تجلّی سے اُسے نسبت نہ تھی گویا
پڑی ہے اس طرح خاکسترِ پروانہ برسوں سے

ترے قربان ساقی، اب وہ موجِ زندگی کیسی
نہیں دیکھی ادائے لغزشِ مستانہ برسوں سے
مری رندی عجب رندی، مری مستی عجب مستی
کہ سب ٹوٹے پڑے ہیں شیشہ و پیمانہ برسوں سے
حسینوں پہ نہ رنگ آیا نہ پھولوں میں بہار آئی
نہیں آیا جو لب پر نغمۂ مستانہ برسوں سے
کھلی آنکھوں سے ہوں حسنِ حقیقت دیکھنے والا
ہوئی لیکن نہ توفیقِ درِ بت خانہ برسوں سے
لباسِ زہد پر پھر کاش نذرِ آتشِ سہیا
کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأتِ رندانہ برسوں سے
جسے لینا ہو آ کر اُس سے اب دردِ جنوں لے لے
سُنا ہے ہوش میں ہے اصغرِ دیوانہ برسوں سے

مَیں کہاں ہُوں کہ اُٹھائیگی قیامت مجھکو

دے مسرت مجھے اور عینِ مسرت تجھ کو
چاہیئے غم بھی بہ اندازۂ راحت مجھ کو
جانِ مشتاق مری موجِ حوادث کے نثار
جس نے ہر لحظہ دیا درسِ محبت مجھ کو
خود میں اُٹھ جاؤں کہ یہ پردۂ ہستی اُٹھ جائے
دیکھنا ہے کسی عنواں تری صورت تجھ کو

دلِ بیتاب میں ہنگامۂ محشر ہے بپا
مار ڈالے نہ تری چشمِ عنایت مجھ کو

آگئی سامنے اِک جلوۂ رنگیں کی بہار
عشق نے آج دکھادی مری صورت مجھ کو

نگہِ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا
اِک ذرا درد میں ملتی جو راحت مجھ کو

آج ہی محو ہے خورشید میں ذرّہ ذرّہ
مَیں کہاں ہوں کہ اُٹھائے گی قیامت مجھ کو

ہم اہلِ راز سب رنگینیٔ مینا سمجھتے ہیں

نمودِ حسن کو حیرت میں ہم کیا کیا سمجھتے ہیں
کبھی جلوہ سمجھتے ہیں، کبھی پردا سمجھتے ہیں

ہم اس کو دیں، اسی کو حاصلِ دُنیا سمجھتے ہیں
مگر خود عشق کو اس سے بھی بے پروا سمجھتے ہیں

کبھی ہیں محوِ دید ایسے، سمجھ باقی نہیں رہتی
کبھی دیدار سے محرُوم ہیں، اتنا سمجھتے ہیں

یکایک توڑ ڈالا ساغرِ مے ہاتھ میں لے کر
مگر ہم بھی مزاجِ نرگسِ رعنا سمجھتے ہیں

کبھی گُل کہہ کے پردہ ڈال دیتے ہیں ہم اُس رُخ پر
کبھی مستی میں پھر گُل کو رُخِ زیبا سمجھتے ہیں

یہاں تو ایک پیغامِ جنوں پہنچا ہے مستوں کو
اب اُن سے پُوچھئے دنیا کو جو دُنیا سمجھتے ہیں
یہی تھوڑی سی مَے ہے اور یہی چھوٹا سا پیمانہ
اِسی سے رِند راز گنبدِ مینا سمجھتے ہیں
کبھی تو جُستجو جلوے کو بھی پردہ بتاتی ہے
کبھی ہم شوق میں پردے کو بھی جلوا سمجھتے ہیں
خوشا وہ دِن کہ حُسنِ یار سے جب عقل خیرہ تھی
یہ سب محرُومیاں تھیں آج ہم جتنا سمجھتے ہیں
کبھی جوشِ جنوں ایسا کہ چھا جاتے ہیں صحرا پر
کبھی ذرّے میں گم ہو کر اُسے صحرا سمجھتے ہیں
یہ ذوقِ دید کی شوخی وہ عکسِ رنگِ محبُوبی
نہ جلوہ ہے نہ پردہ، ہم اسے تنہا سمجھتے ہیں
نظر بھی آشنا ہو نشۂ بے نقش و صُورت سے
ہم اہلِ راز سب رنگینیٔ مینا سمجھتے ہیں
وہ نکہت سے سِوا پنہاں، وہ گُل سے بھی سوا عُریاں
یہ ہم ہیں جو کبھی پردہ، کبھی جلوا سمجھتے ہیں
یہ جلوے کی فراوانی یہ ارزانی، یہ عُریانی
پھر اس شدّت کی تابانی کہ ہم پردا سمجھتے ہیں
دِکھا جلوہ، وہی غارت کنِ جانِ حزیں جلوہ

ترے جلوے کے آگے جان کو ہم کیا سمجھتے ہیں
زمانہ آ رہا ہے جب اُسے سمجھیں گے سب اصغرؔ
ابھی تو آپ خود کہتے ہیں، خود تنہا سمجھتے ہیں

یہ میخانہ ہے اس میں معصیت ہے، باخبر ہونا

وہ اُن کا اِک بہارِ ناز بن کر جلوہ گر ہونا
مِرا وہ رُوح بننا، رُوح بن کر اِک نظر ہونا
یہ آنا جلوہ بن کر اور پھر میری نظر ہونا
یہی ہے دید تو خود دید بھی اے فتنہ گر ہونا
حجاب اس کا ظہور ایسا، ظہور اس کا حجاب ایسا
سِتم ہے خواب میں خورشید کا یوں جلوہ گر ہونا
عجب اعجازِ فطرت ہے، اسیروں کو بھی حیرت ہے
وہ موجِ بُوئے گل کا خود تڑپ کر بال و پر ہونا
جمالِ یار کی زینت بڑھا دی رنگ و صورت نے
قیامت ہے قیامت میرا پابندِ نظر ہونا
ابھی یہ طرزِ مستی مجھ سے سیکھیں میکدے والے
نظر کو چند موجوں پر جما کر بے خبر ہونا

یہاں مَیں ہُوں، نہ ساقی ہے، نہ ساغر ہے، نہ صہبا ہے
یہ میخانہ ہے، اس میں معصیت ہے بے خبر ہونا
طلسمِ رنگ و بو کو جس نے سمجھا، مٹ گیا اصغرؔ
نظر کے لطف کا برباد ہونا ہے نظر ہونا

ماہ و انجم کو تو سرگرمِ سفر سمجھا تھا میں

ذرّے ذرّے میں اسی کو جلوہ گر سمجھا تھا میں
عکس کو حیرت میں آئینہ مگر سمجھا تھا میں
دید کیا، نظارہ کیا، اُس کی تجلّی گاہ میں
وہ بھی موجِ حُسن تھی، جس کو نظر سمجھا تھا میں
پھر وہی واماندگی ہے، پھر وہی بے چارگی
ایک موجِ بُوئے گُل کو بال و پر سمجھا تھا میں
یہ تو شب کو سر بسجدہ، ساکت و مدہوش تھے
ماہ و انجم کو تو سرگرمِ سفر سمجھا تھا میں
دہر ہی نے مجھ پہ کھولی راہِ بے پایانِ عشق
راہبر کو اِک فریب رہ گزر سمجھا تھا میں
کتنی پیاری شکل اِس پردے میں ہے جلوہ فروز

عشق کو ژولیدہ مُو، آشفتہ سر سمجھا تھا میں
تا طلوعِ جلوۂ خورشید پھر آنکھیں ہیں بند
تجھ کو، اے موجِ فنا، نورِ سحر سمجھا تھا میں
مست و بے خود ہیں مہ و انجم، زمین و آسماں
یہ تری محفل تھی جس کو رہ گزر سمجھا تھا میں
ذرّہ ذرّہ ہے یہاں کا رہروِ راہِ فنا
سامنے کی بات تھی جس کو خبر سمجھا تھا میں
پتّے پتّے پر چمن کے ہے وہی چھائی ہوئی
عندلیبِ زار کو اِک مُشتِ پر سمجھا تھا میں
کائناتِ دہر ہے سرشارِ اسرارِ حیات
ایک مستِ آگہی کو بے خبر سمجھا تھا میں
جان ہے محوِ تجلّی، چشم و گوش و لب ہیں بند
حُسن کو حُسنِ بیاں، حُسنِ نظر سمجھا تھا میں
مَیں تو کچھ لایا نہیں اصغرؔ بجز بے مائگی!
سر کو بھی اُس آستاں پر دردِ سر سمجھا تھا میں

مِٹ گئے ہوتے اگر ہم جام و مینا دیکھتے

رقصِ مستی دیکھتے، جوشِ تمنا دیکھتے
سامنے لاکر تجھے اپنا تماشا دیکھتے

کم سے کم حسنِ تخیل کا تماشا دیکھتے
جلوۂ یوسف تو کیا، خوابِ زلیخا دیکھتے

کچھ سمجھ کر ہم نے رکھا ہے حجابِ دہر کو
توڑ کر شیشے کو پھر کیا رنگِ صہبا دیکھتے

روزِ روشن یا شبِ مہتاب یا صبحِ چمن
ہم جہاں سے چاہتے، وہ رُوئے زیبا دیکھتے

قلب پر گرتی تڑپ کر پھر وہی برقِ جمال
ہر بُنِ مو میں وہی آشوب و غوغا دیکھتے

صد رُماں و صد مکلل وایں جہان و آں جہاں
تم نہ آجاتے تو ہم وحشت میں کیا کیا دیکھتے

اِس طرح کچھ رنگ بھر جاتا نگاہِ شوق میں
جلوہ خود بیتاب ہو جاتا، وہ پرداد دیکھتے

جن کو اپنی شوخیوں پر آج اتنا ناز ہے
وہ کسی دن میری جانِ ناشکیبا دیکھتے

میکدے میں زندگی ہے، شورِ نوشانوش ہے
مٹ گئے ہوتے اگر ہم جام و مینا دیکھتے

دُعا تک بھول جاتے مُدّعا اِتنا حسیں ہوتا

مذاقِ زندگی سے آشنا چرخِ بریں ہوتا
مہ و انجم سے بہتر ایک جامِ آتشیں ہوتا

ترے ہی در پہ مٹ جانا لکھا ہے میری قسمت میں
ازل میں یا ابد میں، میں کہیں ہوتا، نہیں ہوتا

وہ اُٹھی موجِ مے، وہ سینۂ مینا دھڑکتا ہے
اسی کا ایک جرعہ کس قدر جاں آفریں ہوتا

نگاہیں دیکھتی ہیں، رُوح قالب میں تڑپتی ہے
مرا کیا حال ہوتا، تو اگر پردہ نشیں ہوتا

طلب کیسی کہاں کا سودِ حاصل کیفِ مستی میں
دُعا تک بھول جاتے، مدّعا اِتنا حسیں ہوتا

خود اپنی ناز برداری سے اب فرصت نہیں دل کو
حسینوں کا تصوّر کیوں نہ اتنا نازنیں ہوتا

ابد تک تجھ سے رہتی داستاں شکر و شکایت کی
نہ کوئی ہم نفس ہوتا، نہ کوئی ہم نشیں ہوتا

ترے قربان ساقی، اب یہ کیا حالت ہے مستوں کی
کبھی عالم تو ہوتا ہے، کبھی عالم نہیں ہوتا

صنم خانے میں کیا دیکھا کہ جا کر کھو گیا اصغر
حرم میں کاش رہ جاتا تو ظالم شیخِ دیں ہوتا

کلی کی آنکھ کھُل جائے چمن بیدار ہو جائے

وہ نغمۂ بُلبلِ رنگیں نوا، اِک بار ہو جائے
کلی کی آنکھ کھُل جائے، چمن بیدار ہو جائے
نظر وہ ہے جو اس کوں و مکاں سے پار ہو جائے
مگر جب رُوئے تاباں پر پڑے، بیکار ہو جائے
تبسم کی ادا سے زندگی بیدار ہو جائے
نظر سے چھیڑ دے، رگ رگ مری ہشیار ہو جائے
تجلّی چہرۂ زیبا کی، ہو، کچھ جامِ رنگیں کی
زمیں سے آسماں تک عالمِ انوار ہو جائے
تم اس کافر کا ذوقِ بندگی اب پوچھتے کیا ہو
جسے طاقِ حرم بھی ابروئے خمدار ہو جائے
سحر لائے گی کیا پیغامِ بیداری شبستاں میں
نقابِ رُخ اُلٹ دو، خود سحر بیدار ہو جائے
یہ اقرارِ خودی ہے، دعویٰ ایماں و دیں کیسا
ترا اقرار جب ہے، خود سے بھی انکار ہو جائے
نظر اِس حُسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے!
کبھی خود پھُول بن جائے، کبھی رُخسار ہو جائے

کچھ ایسا دیکھ کر چپ ہوں بہارِ عالمِ امکاں
کوئی اِک جام پی کر جس طرح سرشار ہو جائے
چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

مٹنے کو یوں مٹیں کہ ابد تک نشاں رہے

آشوبِ حُسن کی بھی کوئی داستاں رہے
مٹنے کو یوں مٹیں کہ ابد تک نشاں رہے

طوفِ حرم میں یا سرِ کوئے بتاں رہے
اِک برقِ اضطراب ہے، ہم جہاں رہے

اُن کی تجلّیوں کا بھی کوئی نشاں رہے
ہر ذرّہ میری خاک کا آتش بجاں رہے

کیا کیا ہیں دردِ عشق کی فتنہ طرازیاں
ہم التفاتِ خاص سے بھی بدگماں رہے

میرے سرشکِ خوں میں ہے رنگینیٔ حیات
یارب فضائے حُسن ابد تک جواں رہے

مَیں رازدارِ حُسن ہُوں، تم رازدارِ عشق
لیکن یہ امتیاز بھی کیوں درمیاں رہے؟

جہاں جہاں وہ چھُپے ہیں عجیب عالم ہے

وہ سامنے ہیں، نظامِ حواسِ برہم ہے
نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے
زمیں سے تا بہ فلک کچھ عجیب عالم ہے
یہ جذبِ مہر ہے یا آبروئے شبنم ہے
بہارِ جلوۂ رنگیں کا اب یہ عالم ہے
نظر کے سامنے حُسنِ نظر مجسم ہے
نگاہِ عشق تو بے پردہ دیکھتی ہے اُسے
خِرد کے سامنے اب تک حجابِ عالم ہے
ردائے لالہ و گُل، پردۂ مہ و انجُم
جہاں جہاں وہ چھُپے ہیں عجیب عالم ہے
نہ اب وہ گریۂ خونیں، نہ اب وہ رنگِ حیات
نہ اب وہ زیست کی لذت کہ درد بھی کم ہے
خوشا حوادثِ پیہم، خوشا یہ اشکِ رواں
جو غم کے ساتھ ہو تم بھی تو غم کا کیا غم ہے
اُسے مجاز کہو یا اسے حجاب کہو

نگاہِ شوق پہ اک اضطراب پیہم ہے
یہ حسنِ دوست ہے اور التجائے جانیازی
تجھے یہ وہم کہ یہ کائناتِ عالم ہے
یہ ذوقِ سیر، یہ دیدارِ جلوۂ خورشید
بلا سے قطرۂ شبنم کی زندگی کم ہے
بس اِک سکوت ہے طاری حرم نشینوں پہ
صنم کدے میں تجلی ہے اور پیہم ہے
نوائے شعلہ طراز و بہارِ حسنِ بتاں
کوئی مٹے تو تری یہ ادا بھی کیا کم ہے
کسی طرح بھی تری یاد اب نہیں جاتی
یہ کیا ہے روزِ مسرت ہے یا شبِ غم ہے؟
کہاں زمان و مکاں، پھر کہاں یہ ارض و سما
جہاں تم آئے، یہ ساری بساط برہم ہے
یہاں فسانۂ دیر و حرم نہیں اصغر
یہ میکدہ ہے، یہاں بے خودی کا عالم ہے

اَب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھئے

تا بہ کے آخر ملالِ شامِ ہجراں دیکھئے
نالہ منے کی طرح اُڑ کر نیستاں دیکھئے

غرق ہیں سب علم و حکمت، دین و ایماں دیکھئے
کِس طرح اُٹھا ہے اِک ساغر سے طوفاں دیکھئے

بے محابا اب فروغِ رُوئے جاناں دیکھئے
فکرِ ایماں کیا، نظر سے عین ایماں دیکھئے

یہ مناظِر کچھ نہیں ہیں جب نظر ہے مُستعار
اپنی آنکھوں سے کسی دن بزمِ امکاں دیکھئے

جِسم کو اپنا سا کر کے لے اُڑی افلاک پر
اللہ اللہ! یہ کمالِ رُوحِ جولاں دیکھئے

اِک تبسم، یا ترنّم، اِک نظر یا نیشتر
کچھ نہ کچھ ہوگا پھڑکتی ہے رگِ جاں دیکھئے

نالۂ رنگیں میں ہم مستوں کے ہے کیفِ شراب
لڑکھڑائے پائے نازک، دیکھئے ہاں دیکھئے

دیدۂ بے خوابِ انجم، سینۂ صد چاکِ گُل
حُسن بھی ہے مبتلائے دردِ پنہاں دیکھئے

رسمِ فرسودہ نہیں شایانِ اربابِ نظر
اب کوئی منظر بلند از کفر و ایماں دیکھئے

مَیں نہ کہتا تھا کہ آفت ہے شرابِ شعلہ رنگ
سوختِ آخر ہو گئے سب کفر و ایماں دیکھئے

دیدۂ بینا فروغِ بادہ و حُسنِ بُتاں
ہر طرف پھیلا ہُوا ہے نُورِ عرفاں دیکھئے

عشق کا ارشاد، پہلو میں ہو بُلبل کا جگر
عقل کہتی ہے رگِ گل میں گلستاں دیکھئے

تیز گامی، سخت کوشی عشق کا فرمان ہے
علم کا اصرار ذرّے میں بیاباں دیکھئے

موسمِ گُل کیا ہے اِک جوشِ شباب کائنات
پھُوٹ نکلا شاخِ گل سے حُسنِ عریاں دیکھئے

قالبِ بے جاں میں جاگ اُٹھا شرابِ زندگی
دیکھئے بُوئے قمیص ماہِ کنعاں دیکھئے

اصغرِ رنگیں نوا کا یہ تغزّل الاماں!
کُفر پھیلاتا ہے یہ مردِ مسلماں دیکھئے

ہر بُنِ مو سے مرے اُس نے پکارا مجھ کو

یہ جہانِ مہ و انجم ہے تماشا مجھ کو
دشت دنیا تھا بہ اندازۂ سودا مجھ کو

اب تو خود شاقِ ہے یہ ہستیٔ بیجا مجھ کو
پھونک دے، پھونک دے اے برقِ تماشا مجھ کو

میرا آئینۂ فطرت ہے عجب آئینہ
نظر آتا ہے ترا چہرۂ زیبا مجھ کو

تیرا جلوہ، ترا انداز، ترا ذوقِ نمود
اب یہ دنیا نظر آتی نہیں دنیا مجھ کو

اب وہی شعلۂ بیتاب ہے رگ رگ میں مری
پھونکے دیتی تھی کبھی تابشِ مینا مجھ کو

ہمہ تن ہستیٔ خوابیدہ مری جاگ اُٹھی
ہر بُنِ مو سے مرے اُس نے پکارا مجھ کو

اب وہی چشمِ فسوں کار مجھے بھول گئی
کس محبت سے کیا تھا تہ و بالا مجھ کو

کونسی بزم سے آتے ہیں جوانانِ چمن
خاک میں لے کے چلا ذوقِ تماشا مجھ کو

جس نے اُفتادگیٔ خاک کی نعمت بخشی
اب اُٹھائے گی وہی برقِ تجلّی مجھ کو

لالہ و گُل کا جگر خون ہوا جاتا ہے
سب سمجھتے ہیں جو ناکامِ تمنّا مجھ کو

توڑ ڈالے مہ و خورشید ہزاروں میں نے
اُس لئے اب تک نہ دکھایا رُخِ زیبا مجھ کو

بوئے گُل بن کے کبھی نغمۂ رنگیں بن کے
ڈھونڈ لیتا ہے ترا حُسنِ خود آرا مجھ کو

علم و حکمت کا ہے اس دور میں آوازہ بلند
لا کے دنیا تو ذرا ساغر و مینا مجھ کو

ایک میرا ہی فسانہ ترِ ازل تا بہ ابد
یوں نہ کرنا تھا مرے سامنے رُسوا مجھ کو

میں سمجھتا تھا مجھے اُن کی طلب ہے اصغر
کیا خبر تھی، وہی لے لیں گے سراپا مجھ کو

جوشِ پرواز کہاں جب کوئی صیّاد نہ ہو

اِس طرح بھی کوئی سرگشتہ و برباد نہ ہو
اِک فسانہ ہوں، جو کچھ یاد ہو، کچھ یاد نہ ہو

دردِ وہ ہے کہ جہاں کو تہ و بالا کر دوں
اس پہ یہ لطف کہ نالہ نہ ہو، فریاد نہ ہو

ایک مُدّت سے تری بزم سے محروم ہوں مَیں
کاش وہ چشمِ عنایت بھی تری یاد نہ ہو

مار ڈالے گی مجھے عافیتِ کنجِ چمن
جوشِ پرواز کہاں، جب کوئی صیّاد نہ ہو

حوصلے عشق کے پامال ہوئے جاتے ہیں
اب یہ بیداد کہیں حُسن پہ بیداد نہ ہو

اِک گُلِ تر کے واسطے مَیں نے چمن لُٹا دیا

حُسن کو وسعتیں جو دیں، عشق کو حوصلہ دیا
جو نہ ملے نہ مٹ سکے، وہ مجھے مُدّعا دیا
ہاتھ میں لے کے جامِ مے آج وہ مُسکرا دیا
عقل کو سرد کر دیا، رُوح کو جگمگا دیا
دل پہ لیا ہے داغِ عشق کھو کے بہارِ زندگی
اِک گُلِ تر کے واسطے مَیں نے چمن لُٹا دیا
لذّتِ دردِ خستگی، دولتِ دامنِ تہی
توڑ کے سارے حوصلے اب مجھے یہ صلا دیا
کچھ تو کہو یہ کیا ہُوا، تم بھی تمھے ساتھ ساتھ کیا
غم میں یہ کیوں سُرور تھا، درد نے کیوں مزا دیا
اب نہ یہ میری ذات ہے، اب نہ یہ کائنات ہے
مَیں نے نوائے عشق کو ساز سے یوں مِلا دیا
عکسِ جمالِ یار کا آئینۂ خودی میں ہے
یہ غمِ ہجر کیا دیا، مجھ سے مجھے چھُپا دیا
حشر میں آفتابِ حشر اور وہ شورِ الاماں
اصغرِ بُت پرست نے زلف کا واسطا دیا

رشحات

ہے خنکیٔ دم سے رعنائیٔ تخیّل — میری بہارِ رنگیں پروردۂ خزاں ہے

مہر و انجم میں بھی انداز ہیں پیمانوں کے — شب کو در بند نہیں ہوتے ہیں میخانوں کے
حشر میں نامۂ اعمال کی پرسش ہے اُدھر — اِس طرف ہاتھ میں ٹکڑے ہیں گریبانوں کے
بجھ گئی کل جو سرِ بزم، وہی شمع نہ تھی — شمع تو آج بھی سینے میں ہے پروانوں کے

جلوہ پائے تو بہ تو ہیں سامنے، اب کیا کریں — ایک دل ہر لحظہ کھوئیں، ایک دل پیدا کریں
کیا یہی لازم تھا ان شوریدگانِ شوق کو؟ — عشق کو پردہ بنائیں حُسن کو رُسوا کریں

کچھ پتہ بتلا سکے یہ طاقتِ بسمل کہاں
زخم جس کو دیکھنا ہو، دیکھ لے قاتل کہاں
محو ہیں سب در پہ اُس کے بندگانِ عاشقی
مَیں کہاں ہوں، دل کہاں ہے، آرزوئے دِل کہاں
لذّتِ جوشِ طلب، ذوقِ تکاپوئے دوام
ورنہ ہم شوریدگانِ شوق کی منزل کہاں

خوب جی بھر کے اُٹھا لے جوشِ وحشت کے مزے
پھر کہاں یہ دشت، یہ ناقہ کہاں محمل کہاں

ذوقِ طلب حصُول سے جو آشنا نہ ہو
یعنی وہ دردِ چاہیئے جس کی دوا نہ ہو
دیکھا ہے برقِ طور کو بھی فرشِ خاک پر
افتادگیٔ عشق اگر نارسا نہ ہو
صہبائے خوشگوار بھی یارب کبھی کبھی
اِتنا تو ہو کہ تلخیٔ غم بے مزا نہ ہو
ہر ہر قدم پہ جلوۂ رنگیں ہے تو یہ تو
خود تنگیٔ نگاہ جو زنجیرِ پا نہ ہو
چھایا ہُوا ہے ہر دو جہاں میں جمالِ دوست
اے شوقِ دید چشم بھی اب وا ہو یا نہ ہو

فارسی اشعار

در حریمش امتیازِ ایں و آں بے سُود بُود
جانِ مشتاقاں بہ سیرِ بود و ہم نابُود بُود

ما بہر طرزے کہ می رفتیم، شایانش نبُود
اُو بہر رنگے کہ می آید، ہماں مقصُود بُود

آرزو پیکر تراشش و شوقِ من جاں آفریں
شب، معاذ اللہ ہمیں مخلوقِ من معبُود بُود

من ہم از دیر و حرم صد بہرہ می داشتم
لیک در میخانہ ہر راہے بمن مسدُود بُود

در حریمِ عشق ایں رمزِ حیات آموختند
بے زیاں سُودے کہ من می خواستم، بے سُود بُود

من نوائے خویش را آوردم از جائے دِگر
در چمن ہنگامۂ محدُود و نامحدُود بُود

اے کہ تو دریائے خوبی و اے توئی بحرِ وجُود
لافِ منصوری کہ مے زد، قطرۂ بے بُود بُود

شورشِ عشق و نوائے آتشیں حسنِ بُتاں

زندگی جائے کہ می دیدم، ہموں موجود بود
تو بہر شغلے کہ می باشی، ہماں معبودِ تست
آں شکست و ریخت ہم بُت خانۂ محمود بود

یہ غزل قیامِ لاہور کے زمانہ میں لکھی گئی تھی۔ علامہ اقبال نے اُسے سُن کر بہت پسند فرمایا اور خود بھی دو شعر اُسی وقت موزوں کر کے دیئے اور ہدایت فرمائی کہ انہیں بھی اپنی غزل کے ساتھ رکھنا:۔

علّامہ اقبالؒ

چشمِ آدم آں سوئے افلاک نورش ہم نہ یافت
از خیالِ مہر و ماہ اندیشہ گرد آلود بود
مَن درونِ سینۂ خود سومناتے ساختم
آستانِ کعبہ را دیدم، جبیں فرسود بود

ہر صدائے کہ بمن می رسد، از سازِ من است
اندریں گنبدِ ہستی ہمہ آوازِ من است
خندہ چوں شورشِ دِل، عشوہ چو تابِ جاں
ہر ادائے کہ تو داری، ہمہ اندازِ من است

زفیضِ ذوقِ رنگیں صد بہارے کردہ ام پیدا
زخونِ دل کہ می جوشد نگارے کردہ ام پیدا
بسے روحانیاں را در کمندِ شوق آوردم
بہ اوجِ عرشِ اعلیٰ ہم سکارے کردہ ام پیدا
زموجِ خونِ دلِ صد بار من رنگیں قبا گشتم
بخاکِ کربلا ہم صد بہارے کردہ ام پیدا
زسلا، تسخیر کردم ایں جہانِ ماہ وانجم را
زجوشِ بندگی پروردگارے کردہ ام پیدا
بجے از جلوہ حسنت جہاں یکسر نمی ماند
بیا اکنوں کہ خود را پردہ دارے کردہ ام پیدا
جہانے را تپش بخشم، جہانے را بوجد آرم
دریں خاکسترے حسنِ شرارے کردہ ام پیدا
منِ مسلم، چہ مسلم؟ آنکہ اورا یار مے گوید
پس از عمرے ہمیں زنار دارے کردہ ام پیدا
جہانِ مضطرب را پرسکوں دانی، نمی دانی
چساں در بیقراری ہا قرارے کردہ ام پیدا
مگر اے پیروِ طرزِ جنونِ من! نمے دانی
پسِ محمل نشینے صد عبارے کردہ ام پیدا

من از رنگِ وجودِ خویش اصفر نقشها چینم
برائے جانِ بیجود مست یارے کردہ ام پیدا

مرا بس است کہ رنگینیٔ نظر دارم
بگیر عالمِ خود، عالمِ دگر دارم
خرابِ بادۂ خویشم، ہلاکِ ذوقِ خودم
ہجومِ جلوہ بہ اندازۂ نظر دارم
چہ درد و چارۂ درد از کجا، نمی دانم
منے کہ خود بہ رگِ خویش نیشتر دارم
بہ پہلوئے مہ و انجم بساط آرایم
قلندرانہ گہے عزمِ صد سفر دارم
ہزار عشوۂ رنگیں ہزار بار بکن
غمے مخور کہ بہ پہلو دلے دگر دارم
جہاں دو روزہ و انجامِ زیست خواب دوام
بیار بادہ کہ من ہم ازیں خبر دارم
مرا کہ شمۂ ساقی چو یاد می آید
ہزار برق بخوں نابۂ جگر دارم
بیا کہ سوختن و گم شدن بیاموزم
دریں سرائے فنا فرصتِ شرر دارم

بہ شب ہائے سیاہے چند آہے کردہ ام پیدا
بہ ہر سیارۂ صد رسم و راہے کردہ ام پیدا
جمالِ لالہ و گل را ہزاراں رنگہا بخشم
زفیضِ جلوۂ حسنت نگاہے کردہ ام پیدا
تو در قیدِ جہاں پابستہ و صد شکوہ سنجیہا
من از ہر ذرّہ سازے کردہ راہے کردہ ام پیدا
غبار از دامنِ خود بارہا افشاندہ ام اصغرؔ
بہ ہنگامِ جنوں صد مہر و ماہے کردہ ام پیدا

آخری غزل!

(اُردو)

عیاں ہے رازِ ہستی، چشمِ حیرت باز ہے ساقی
کہ محوِ راز ہو جانا کشودِ راز ہے ساقی
وہ اُٹھی موجِ مے، وہ جام و مینا میں تلاطم ہے
جہانِ بے نشاں سے دعوتِ پرواز ہے ساقی
یہاں اِک خاک دانِ عنصری میں کیا گزرتی ہے
تو ہی ہمراز ہے ساقی، تو ہی دم ساز ہے ساقی
سُنا کرتا ہوں راتوں کو برابر نعرۂ مستی
تری آواز ہے یا خود مری آواز ہے ساقی

——— (غیر مطبوعہ)

KULLIYAT-E-ASGHAR

(Urdu Poetry)

by

ASGHAR GONDVI

ہماری مطبوعات ایک نظر میں

ادب و تنقید

جدید اصول تنقید		پروفیسر ارشاد علی خان
قدیم دکنی شاعری میں مشترکہ کلچر		ڈاکٹر انوری بیگم
تین ناول نگار	(قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین، انتظار حسین)	رضی عابدی
اردو تفاسیر بیسویں صدی میں		ڈاکٹر سید شاہد علی
مسلمانان ہند		ڈاکٹر سید شاہد علی
ہندوستان میں دعوت دین: مسائل و امکانات		ڈاکٹر سید شاہد علی
دراسات اسلامیہ کے فروغ میں ہندوؤں کی خدمات		ڈاکٹر شیخ محمد اسماعیل اعظمی
بیان غالب شرح دیوان غالب		آغا محمد باقر
اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	(آغاز سے ۲۰۰۰ء تک)	ڈاکٹر سلیم اختر
رضا نقوی واہی۔ آئینہ در آئینہ		ڈاکٹر ہمایوں اشرف
منٹو نامہ		جگدیش چندر ودھاون
کرشن چندر شخصیت اور فن		جگدیش چندر ودھاون
عصمت چغتائی شخصیت اور فن		جگدیش چندر ودھاون
اردو میں لوک ادب		پروفیسر قمر رئیس
تلاش اقبال		محمد علی صدیقی
مکتوبات اقبال		عاقف نفیس
مشتاق احمد یوسفی: ایک مطالعہ		مظہر احمد
اردو ادب کی تحریکیں		ڈاکٹر انور سدید
اردو ریپورتاژ تاریخ و تنقید	(ابتدا تا ۱۹۹۰ء)	ڈاکٹر طلعت گل
آب حیات	پیپر بیک	محمد حسین آزاد
آب حیات	مجلد	محمد حسین آزاد
اردو کے بہترین شخصی خاکے		مبین مرزا
تناظر	سہ ماہی ادبی رسالہ	بلراج ورما

KITABI DUNIYA
1955, Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
Phone: 23288452, Mobile: 011-35972589
E-mail: kitabiduniya@rediffmail.com

ISBN-81-87666-86-2